نغمہ نما

فراق گورکھپوری

سٹار پاکٹ بکس سیریز نمبر ۳۴

سٹار پبلیکیشنز
۲۷۶۱ - دریا گنج - دہلی ۶

قیمت صرف ایک روپیہ

مطبوعہ:- ہیری آرٹ پریس دریا گنج، دہلی

سول انجینئرس

پنجابی پستک بھنڈار دہلی ۶

فہرست

فراق گورکھپوری

ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ ہے۔ پاکستان کی آبادی گیارہ کروڑ ہے۔ ان اکیاون کروڑ انسانوں میں مشکل سے پانچ ہزار ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے اتنی تعلیم حاصل کی ہو جتنی فراق گورکھپوری کے حصہ میں آئی ہے لیکن جہاں تک ادبی اور شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے ہندوستان و پاکستان کی تمام زبانوں میں مشکل سے کسی اور کو فراق کی ہمسری و برابری کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے۔ پورے ایشیا میں فراق کے مرتبہ کا شاعر ڈھونڈھ نکالنا آج ممکن نظر نہیں آتا۔ اردو شاعری میں بڑے بڑے اشعار میر، غالب اور آتش اور اقبال کے یہاں کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اگر زیادہ سے زیادہ تعداد میں بڑے سے بڑے اشعار کہیں ملیں گے تو وہ فراق کے یہاں ملیں گے بڑے اشعار عظیم ترین دل و دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار ہمیں ان گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتے ہیں جو ہمارے شعور کو عظمت کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ فراق کی شاعری ہمیں عظمتیں بانٹتی ہے۔ آج ہندوستان پاکستان میں سب کی آنکھیں فراق ہی پر پڑ رہی ہیں۔

"نغمہ نما" فراق کے بہترین کلام کا ایک مختصر سا انتخاب ہے۔ اس میں فراق کی وہ غزلیں وہ نظمیں وہ رباعیاں اور متفرق اشعار کے وہ جواہر پارے ملیں گے جو ہماری زندگی کو گہرے اور مستقل طور پر اندر سے بدل دیں، ان اشعار کی آب ہوا برصغیر ہندوستان و پاکستان کی بہترین آب و ہوا ہے۔ ان اشعار میں وہ رس بسا ہے جسے ہم کئی ہزار برس کی تہذیب کی دین کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں ان اشعار

ہیں وہ لطافتیں اور لذتیں ملیں گی، وہ رنگینی ملے گی وہ معصومیت ملے گی، وہ سرمدی نغمے ملیں گے جو زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے ہم یہ نغمے بار بار گنگنائیں گے اور سر دھنیں گے۔ آنے والی نسلیں صدیوں تک ان نغموں کے آبِ حیات سے اپنی پیاس بجھاتی رہیں گی۔ یہ نغمے سدا بہار اور سدا سہاگ ہیں۔

فراق ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء کو اس شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے جس سرزمین کا رشتہ تعلق مہاتما گوتم بدھ، بابا گورکھ ناتھ، مہاتما کبیر داس اور کئی اور بڑے ہندو مسلمان روحانی رہنماؤں سے رہا ہے۔ فراق ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جسے ہندو مسلم تہذیب کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔ فراق کا بچپن اُن کی جوانی اور زندگی کتنی غیر معمولی رہی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ فراق کی اُس نظم سے ہوگا جس کا عنوان "ہنڈولہ" ہے جو اس مجموعے میں شامل ہے۔ یہ نظم فراق کی روحانی سوانحعمری ہے اُن کے ذہنی و فنی ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان صفحات میں جیسی البیلی شاعری ملے گی، ایسی مالا مال شاعری ہمیں دینے والا کوئی دوسرا کوئی شاعر شاید بہت دنوں بعد ہی پیدا ہو سکے گا۔

ہم نے اس آواز کو پالا ہے مر مر کے فراق!
آج جس کی نرم لو ہے شمعِ محرابِ حیات

ناشر

غزلیں

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اک شرحِ حیات ہو گئی ہے

جب دل کی وفات ہو گئی ہے
ہر چیز کی رات ہو گئی ہے

غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو
کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے

مدت سے خبر ملی نہ دل کی
شاید کوئی بات ہو گئی ہے

جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری
تصویرِ حیات ہو گئی ہے

اب ہو مجھے دیکھئے کہاں صبح
ان زلفوں میں رات ہو گئی ہے

دل میں تجھ سے تھی جو شکایت
اب غم کے نکات ہو گئی ہے

اقرارِ گناہِ عشق سن لو
مجھ سے اک بات ہو گئی ہے

جو چیز بھی مجھ کو ہاتھ آئی
تیری سوغات ہو گئی ہے

کیا جانئے موت پہلے کیا تھی
اب میری حیات ہو گئی ہے

گھٹتے گھٹتے تری عنایت
میری اوقات ہو گئی ہے

اس چشمِ سیہ کی یاد یکسر
شامِ ظلمات ہو گئی ہے

اس دور میں زندگی بشر کی!   بیمار کی رات ہو گئی ہے
جیتی ہوئی بازیٔ محبت   کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں!   جب غم سے نجات ہو گئی ہے
وہ چاہیں تو وقت بھی بدل دیں   جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے
دنیا ہے کتنی بے ٹھکانہ   عاشق کی برات ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی   اب برق صفات ہو گئی ہے
جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے   اک برگِ نبات ہو گئی ہے
اکا دکا صدائے زنجیر   زنداں میں رات ہو گئی ہے

اک اک صفت فراق اس کی
دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

رات بھی نیند بھی، کہانی بھی — ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی
ایک پیغامِ زندگانی بھی — عاشقی مرگِ ناگہانی بھی
اس ادا کا تری جواب نہیں — مہربانی بھی سرگرانی بھی
دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں — کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی
منصبِ دل خوشی لٹانا ہے — غمِ پنہاں کی پاسبانی بھی
دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب — زندگی آگ بھی ہے پانی بھی
شادکاموں کو یہ نہیں توفیق! — دلِ غمگیں کی شادمانی بھی
لاکھ حسنِ یقیں سے بڑھ کر ہے — ان نگاہوں کی بدگمانی بھی
تنگنائے دلِ ملول میں ہے — بحرِ ہستی کی بے کرانی بھی
عشقِ ناکام کی ہے پرچھائیں — شادمانی بھی، کامرانی بھی
دیکھ دل کے نگار خانے میں — زخمِ پنہاں کی ہے نشانی بھی
خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی! — کچھ سنوں میں تری زبانی بھی
آئے تاریخِ عشق میں سو بار — موت کے دورِ درمیانی بھی
اپنی معصومیت کے پردے میں — ہوگئی وہ نظر سیانی بھی
دن کو سورج مکھی ہے وہ نوگل — رات کو ہے وہ رات رانی بھی

دلِ بدنام تیرے بارے میں — لوگ کہتے ہیں اِک کہانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دُنیا — کہ یہ دُنیا ہوئی پُرانی بھی

دل کو آدابِ بندگی بھی نہ آئے — کر گئے لوگ حکمرانی بھی

جورِ کم کم کا شکریہ بس ہے — آپ کی اتنی مہربانی بھی

دل میں اک ہوک بھی اٹھی اے دوست — یاد آئی تری جوانی بھی

سر سے پا تک سپردگی کی ادا — ایک اندازِ ترکمانی بھی

پاس رہنا کسی کا رات کی رات — میہمانی بھی میزبانی بھی

ہو نہ عکسِ جبینِ ناز کہ ہے — دل میں اک نورِ کہکشانی بھی

زندگی عین دیدِ یار فراقؔ
زندگی ہجر کی کہانی بھی

○

بے ٹھکانے ہے دلِ غمگیں ٹھکانے کی کہو
شامِ ہجراں دوستو کچھ اُس کے آنے کی کہو

ہاں نہ پوچھو اک گرفتارِ قفس کی زندگی!
ہم صفیرانِ چمن کچھ آشیانے کی کہو

اُڑ گیا ہے منزلِ دشوار میں غم کا سمند
گیسوئے پُر پیچ و خم کے تازیانے کی کہو

بات بنتی اور باتوں سے نظر آتی نہیں
اُس نگاہِ ناز سے باتیں بنانے کی کہو

داستاں وہ تھی جسے دل بجھتے بجھتے کہہ گیا
شمعِ بزمِ زندگی کے جھلملانے کی کہو

کچھ دلِ مرحوم کی باتیں کرو اے اہلِ غم
جس سے ویرانے تھے آباد اس دِوانے کی کہو

داستانِ زندگی بھی کس قدر دلچسپ ہے
جو ازل سے چھڑ گیا ہے اس فسانے کی کہو

یہ فسونِ نیم شب یہ خواب ساماں خامشی
سامری فن آنکھ کے جادو جگانے کی کہو

کوئی کیا کھائے گا یوں سچی قسم، جھوٹی قسم
اس نگاہِ ناز کے سوگند کھانے کی کہو

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزمِ سخن
کچھ فراقؔ اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

○

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے
ہر بزم کی جان ہو گئی ہے

آنکھیں پڑتی ہیں میکدوں کی
وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے

آئینہ دکھا دیا یہ کس نے
دنیا حیران ہو گئی ہے

اس نرگسِ ناز میں تھی جو بات
شاعر کی زبان ہو گئی ہے

اب تو تری ہر نگاہ کافر!
ایمان کی جان ہو گئی ہے

ترغیبِ گناہ لحظہ لحظہ
اب رات جوان ہو گئی ہے

توفیقِ نظر سے مشکلِ زیست
کتنی آسان ہو گئی ہے

تصویر بشر ہے نقشِ آفاق! — فطرتِ انسان ہو گئی ہے

پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی — اب اک جہان ہو گئی ہے

سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر — صحرا کی اذان ہو گئی ہے

اے موت! بشر کی زندگی آج — تیرا احسان ہو گئی ہے

کچھ اب توانا ہو کہ دنیا — کتنی ہلکان ہو گئی ہے

یہ کس کی پڑیں غلط نگاہیں — ہستی بہتان ہو گئی ہے

انسان کو خریدتا ہے انسان — دنیا بھی دکان ہو گئی ہے

اکثر شبِ ہجر دوست کی یاد! — تنہائی کی جان ہو گئی ہے

شرکت تری بزمِ قصہ گو میں — افسانے کی جان ہو گئی ہے

جو آج مری زبان تھی۔ کل — دنیا کی زبان ہو گئی ہے

اک سانحۂ جہاں ہے وہ آنکھ — جس دن سے جوان ہو گئی ہے

رعنائی قامتِ دل آرا — میرا ارمان ہو گئی ہے

دل میں اک وارداتِ پنہاں — بے سان گمان ہو گئی ہے

سنتا ہوں قضائے قہرماں بھی — اب تو رحمان ہو گئی ہے

واعظ مجھے کیا خدا سے — میرا ایمان ہو گئی ہے

میری تو یہ کائناتِ غم بھی — جان و ایمان ہو گئی ہے

میری ہر بات آدمی کی عظمت کا نشان ہو گئی ہے
یادِ ایامِ عاشقی جب ابدیت اک آن ہو گئی ہے
جو شوخ نظر تھی دشمنِ جاں وہ جان کی جان ہو گئی ہے

ہر بیت فراقؔ! اس غزل کی
ابرو کی کمان ہو گئی ہے

شکلِ فقیرِ بے نوا پھرتے ہیں جن کو ہم لیے
ہاں انہی جھولیوں میں ہیں راز تونگری کے بھی

سر بھی جھکا چکا ہے عشق حُسن کے پائے ناز پر
ناز اٹھا چکا ہے حسن عشق کی خود سری کے بھی

رات تری نگاہِ ناز کتنے فسانے کہہ گئی
غمزۂ کافری کے بھی عشوۂ دلبری کے بھی

شعلے اُٹھے زمین سے دیکھ کرشمے اے نگاہ
اس کے خرامِ ناز کے فتنہ سرسری کے بھی

پڑھ کبھی آیتِ شفق قلب و نظر کا واسطہ
جلوۂ رنگ رنگ میں رنگِ پیمبری کے بھی

چھیڑ دیا غزل میں آج میں نے وہ نغمۂ زمیں
اُڑ گئے گھونگھٹ اے فراق زہرہ و مشتری کے بھی

زمیں بدلی، فلک بدلا، مذاقِ زندگی بدلا
تمدن کے قدیم اقدار بدلے آدمی بدلا

خدا و اہرمن بدلے وہ ایمانِ دوئی بدلا
حدودِ خیر و شر بدلے مذاقِ کافری بدلا

نئے انسان کا جب دورِ خود ناآگہی بدلا
رموزِ بیخودی بدلے تقاضائے خودی بدلا

بدلتے جا رہے ہیں ہم بھی دُنیا کو بدلنے میں
نہیں بدلی ابھی دُنیا، تو دُنیا کو ابھی بدلا

نئی منزل کے میرِ کارواں بھی اور ہوتے ہیں
پُرانے خضرِ رہ بدلے وہ طرزِ رہبری بدلا

کبھی سوچا بھی ہے اے نظمِ کہنہ کے خداوندو
تمہارا حشر کیا ہو گا جو یہ عالم کبھی بدلا

اِدھر پچھلے سے اہلِ مال و زر پر رات بھاری ہے
اُدھر بیدارئ جمہور کا انداز بھی بدلا

زہے سوزِ غمِ آدم، خوشا سازِ دلِ آدم
اسی اک شمع کی لو نے جہانِ تیرگی بدلا

نئے منصور ہیں صدیوں پرانے شیخ و قاضی ہیں
نہ فتوے کفر کے بدلے نہ عذرِ دار ہی بدلا

بتائے تو بتائے اُس کو تیری شوخیٔ پنہاں
تری چشمِ توجہ ہے کہ طرزِ بے رُخی بدلا

بہ فیضِ آدمِ خاکی زمیں سونا اگلتی ہے
اسی ذرّے نے دورِ مہر و ماہ و مشتری بدلا

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آ کے خوابِ زندگی بدلا

فراقِ ہمنوائے میر و غالب اب نئے نغمے
وہ بزمِ زندگی بدلی وہ رنگِ شاعری بدلا

یہ صباحت کی ضو یہ چکاں مہ چکاں — یہ پسینے کی رو کہکشاں کہکشاں

عشق تھا ایک دن داستاں داستاں — آج کیوں ہے وہی بے زباں بے زباں

دل کو پایا نہیں منزلوں منزلوں — ہم پکار آئے ہیں کارواں کارواں

عشق بھی شادماں شادماں ان دنوں — حسن بھی ان دنوں مہرباں مہرباں

ہے ترا حسنِ دلکش سراپا سوال — ہے تری ہر ادا چیستاں چیستاں

دم بدم شبنم و شعلہ کی یہ لویں — سر سے پا تک بدن گلستاں گلستاں

بیٹھنا ناز سے انجمن انجمن — دیکھنا ناز سے داستاں داستاں

مہکی مہکی فضا خوشبوئے زلف سے — پنکھڑی ہونٹ کی گلفشاں گلفشاں

جس کے سائے میں اک زندگی کٹ گئی — عمر زلفِ رسا جاوداں جاوداں

لے اڑی ہے مجھے بوئے زلفِ سیہ — یہ کھلی چاندنی بوستاں بوستاں

آج سنگم سراسر جو عشق ہے — ایک دریائے غم بیکراں بیکراں

جس طرف جایئے مطلع نور نور — جس طرف جایئے مہوشاں مہوشاں

بو زمیں سے مجھے آ رہی ہے تری — تجھ کو کیوں ڈھونڈھیے آسماں آسماں

سچ بتا مجھ کو کیا یونہی کٹ جائے گی — زندگی عشق کی رائیگاں رائیگاں

روپ کی چاندنی سوزِ دل سوزِ دل — موجِ گنگ و جمن سازِ جاں سازِ جاں

عہد و پیماں کوئی حُسن بھی کیا کرے — عشق بھی تو ہے کچھ بدگماں بدگماں

چاہیے کونین کے دل پہ ہو بوجھ سا — عشق سے حُسن ہی سرگراں سرگراں

کیوں فضاؤں کی آنکھوں میں تھا اشک سے — وہ سدھارے ہیں جب شادماں شادماں

لب پہ آئی نہ وہ بات ہی ہم نشیں — آئے کیا کیا سخن درمیاں درمیاں

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ڈھونڈھ لیں گے تجھے — گو نشاں ہی ترا بے نشاں بے نشاں

میرے دارالاماں اے حریمِ نگار — ہم پھریں کیا یونہی بے اماں بے اماں

یوں گھلے گا گھلے گا ترے عشق میں — رہ گیا عشق اب استخواں استخواں

ہم کو سُننا بہرحال تیری خبر — ماجرا ماجرا داستاں داستاں

اُس کے تیور پہ قربان لطف و کرم — مہرباں مہرباں قہرماں قہرماں

جی میں آتا ہو تجھ کو پکارا کروں — رہ گزر رہ گزر آستاں آستاں

یاد آنے لگیں پھر ادائیں تری — دلنشیں دلنشیں جانستاں جانستاں

کیوں نہ سے غم کی چنگاریاں ہوگئیں — سوزِ دل سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ جاں

ساتھ ہے رات کی رات وہ رشکِ مہ — میزباں میزباں میہماں میہماں

عشق کی زندگی بھی غرض کٹ گئی — غمزدہ غمزدہ شادماں شادماں

اب پڑے اب پڑے اُسکے ماتھے پہ بل — الحذر الحذر الاماں الاماں

عشق خود اپنی تعریف یوں کر گیا   اہرمن اہرمن ایزداں ایزداں

کیف دستی ہیں امکاں در امکاں فراق

چاندنی ہے ابھی نوجواں نوجواں

زہے آب و گل کی یہ کیمیا ہے چمن کہ معجزۂ نمو

نہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ، وہی خار و خس وہی رنگ و بو

مل گیا تجھ کو جمالِ رُخِ رنگیں کا چمن !
دلِ سوزاں کا یہ تپتا ہوا بن مجھ کو دیا

تیرے بطلان تھے لائے جو مجھے حق کی طرف
تو نے ایمان مرا شیخِ زمن مجھ کو دیا

میرے دل سے مرا ہر شعر کہہ اُٹھا تو نے
عشوہ و نازِ نگہِ سامری فن مجھ کو دیا

نعرۂ حق نے کیا مرتبۂ عشق بلند
منصبِ جلوہ دہِ دار و رسن مجھ کو دیا

دستِ قدرت نے بس اک پیکرِ خاکی مجھ کو
سحرِ نو کی ننھی خوابیدہ کرن مجھ کو دیا

ختم ہے مجھ پہ غزل گوئیِ دورِ حاضر
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

شاعرِ عصر کی تقدیر نہ کچھ پوچھ فراق
جو کہیں گا بھی نہ رکھے گا وہ فن مجھ کو دیا

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دُنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پہ کامیاب انسان لیتے ہیں

نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

حیاتِ عشق کا اک اک نفس جامِ شہادت ہے
وہ جانِ نازبرداراں کوئی آسان لیتے ہیں

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوانِ دگر وہ مان لیتے ہیں

تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت
کہ اُس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

اب اس کو کفر مانیں یا بلندئ نظر جانیں
خدائے دوجہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں

جب صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگند کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں

رفیقِ زندگی تھی اب انیسِ وقتِ آخر ہے
ترا اے موت! ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

زمانہ وارداتِ قلب سُننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

فراق اکثر بدل کر بھیس پھرتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

بطرز مصحفی

بزمِ ساقی سے اُٹھا ہے کوئی یوں رات ہے
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

ڈال کر سمتِ وطن ایک اچٹتی سی نگاہ
ہم سوئے دشتِ جنوں لے کے ترا نام چلے

اکثر اس عالمِ بے نام کی یاد آتی ہے
جس سے مل جاتے ہیں دنیائے محبت کے سرے

اُف حجاباتِ دو عالم کہ پہنچتے نہیں ہاتھ
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

کاروبارِ دلِ عشاق عجب دھندا ہے
جس قدر فائدہ ہو اتنے ہی گھاٹے میں رہے

کسی گونگے کا ہے سپنا تو سبھا بہروں کی
عشق وہ قصہ جسے کون کہے کون سُنے

اس شہادت گہِ ہستی میں جو ڈور ٹوٹر کے جئیں
زندگی دور رہی موت بھی پاس نہ بھٹکے

اس نئے دورِ محبت کے تقاضے ہیں کچھ اور
کیوں کوئی ہوش کرے عشق میں دیوانے بنے

چشمِ حیراں نے طلسماتِ جہاں دیکھ لیا
آج کیا کیا تری نظروں نے دیئے ہیں دھوکے

داستانِ عشق کی دہرا گئی تاروں بھری رات
کتنی یادوں کے چراغ آج جلے آج بجھے

نہ ملی پر نہ ملی کفر کی منزل اے واعظ
خود کو کرتے رہے گمراہ خدا کے بندے

یہی رندوں کی دعا ہے سرِ میخانہ ترا
ساقیا جام چلے کام چلے نام چلے

موجزن کوثر و تسنیم تری زلفوں میں
جنتیں مجھ کو ملی ہیں ترے قدموں کے تلے

دولتِ درد بڑی چیز ہے اے عشق بڑا
قرعۂ فال ترے نام۔ خدا جس کو دے

غمِ تصویر بھی دیکھا ہے قدرِ رعنا کو
کچھ وہ پلکوں میں نمی، سرد نفس، بال کھلے

ارجن و رستم و چنگیز کی ہمت نہ پڑی
کام وہ عشق نے انجام دئے زندہ رہے

مجھ سے بالشتیے بڑھ جائیں گے اللہ رے زعم
کس ہمالہ کو یہ سر کرنے چلے ہیں بونے

کون کہتا ہے ہر اک سے نہ ملے رات تری
نگہِ ناز مری سمت بھی گاہے گاہے

ہم تو یہ کہتے ہیں گو روتی ہے دُنیا اُن کو
مر گئے جو ترے بیمار فراق اچھے رہے

عمر آوارگیٔ عشق میں جب ختم ہوئی
جا کے اس وقت کھلا ہم کہیں آئے نہ گئے

اُف وہ اک بات جسے کہہ نہ سکوں تیرے حضور
آہ! وہ ایک قسم مجھ سے جو کھلائے نہ بنے

دیکھنے کی ہے یہ مجبوریٔ عشق نادم
کس طرح اپنے پسینے میں کوئی ڈوب مرے

اُس نے کی پُرسشِ حالات تو مُنہ پھیر لیا
دلِ غمگیں کے انداز، خدا خیر کرے

آہ ان جلووں کے ہوتے ہوئے قائم ہیں حواس
ہم تری انجمنِ ناز کے قابل نہ رہے
دوست کی یاد میں رونے کو تم اوقاتِ فراق
مجھ سے جو پوچھتے ہو ۔۔ رات گئے رات رہے

تو ہے سر بسر کوئی داستاں، ہے عجیب عالمِ انجمن
یہ نگاہِ ناز زباں زباں یہ سکوتِ ناز سخن سخن
یہ شعورِ صاعقہ افگنی، یہ ادائے نرگسِ پُرفتن
کہ پلا پلا کے لُنڈھائے دے یہ تری نگاہِ پیالہ زن
تری قربتیں بھی ہیں دوریاں یہ کرشمۂ کششِ بدن
چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنارِ من، نہ کنارِ من[۵]

---

۵ ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما — چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما (بیدل)

نہ زیادہ ظرف سے دے نہ کم کہ یہیں ہاتھ اُس کے جیسے کھُلے

ہے وہی آنکھ فضا منِ ہوش بھی وہی آنکھ ساقیِ انجمن

مِرے سینے میں ہے وہ روشنی کہ نہ عمر جس کی بتا سکیں

یہیں جلوے دورِ جدید کے یہیں پرتوِ عہدِ کہن

وہ تمام روئے نگار ہے وہ تمام بوس و کنار ہے

وہ ہے چہرہ چہرہ پہ بھیسے وہ ہے چپ مئے تو دہن دہن

یہ خیالِ محفلِ دوستاں کسی اجنبی کا ہے یہ بیاں

وہ جہاں نہ سمجھیں مِری زباں وہی قسمتوں سے ملا وطن

وہ نظر نظر کی فسوں گری وہ سکوت کی بھی سخنوری

تِری آنکھ جادوئے سامری ترے لب فسانۂ نل دمن

وہ گناہِ آدمِ اولیں کہ ہے مستیوں کا وہی امیں

ہیں بشر کے خون سے آج بھی کسی جرعہ ہائے مے عدن

یہ کمالِ جذبِ دلِ تپاں کبھی بدلے گردشِ آسماں

کوئی صبح روئے چمن چمن کوئی شام زلف شکن شکن

یہ بھی اک بہانہ تھا کھلنے کا تری کج کلاہیوں کی قسم

سرِ شاخسار دکھا گئے کئی بار غنچے جو بانکپن

وہ تبسمِ لبِ نازنیں وہ بہارِ پیکرِ دل نشیں!
وہی ادھ کھلی سی کلی کلی وہی تازگی چمن چمن

کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکن آ ہواں ہے درم خمار ترا بدن

کبھی دادِ شوق نہ دے سکا مرے دل کو پرتوِ دلبری
کہ لرز گیا ہے کوئی آئینہ جو لچک گئی ہے کوئی کرن

کوئی میری آنکھوں سے دیکھتا تری بزمِ ناز کی وسعتیں
وہ ہر ایک گوشہ مکاں مکاں وہ ہر ایک لمحہ زمن زمن

وہ لبوں کی لعل ضیا ضیا وہ کرن ہنسی کی ذرا ذرا
تری نیم ادا بھی ادا ادا تری اک جھلک بھی یمن یمن

کوئی چیز آڑے تو آگئی کہ تخیر ہو گیا خاتمہ
مری بے کسی نے اڑھا دیا مرے آنسوؤں کا مجھے کفن

مرے دوستوں کو معمہ ہے مری نور و نار کی زندگی
جو ادھر چراغِ حرم کی لو تو ادھر بھی کفر ہے شعلہ زن

کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں شروع ہی سے گھے ایزد و گھے اہرمن

اے اُکھڑی اُکھڑی یہ زندگی ارے کھوئی کھوئی یہ زندگی

مجھے کیا وطن میں سکون ہو کہ وطن ہی آج ہے بے وطن

جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی

یہ سوادِ شامِ اجل نما یہ ضیائے صبحِ کفن کفن

تجھے منزلیں بھی ہیں رہگذر مجھے رہگذاریں بھی منزلیں

یہی فرق ہے مرے ہمسفر وہ ترا چلن یہ مرا چلن

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالئے

مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو

کہ غزل ہوئی تو رگوں میں ہے وہی خستگی سی وہی تھکن

یہ اُداس اُداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی

مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن!

○

یہ تو نہیں کہ غم نہیں ہاں مری آنکھ نم نہیں

تم بھی تو تم نہیں ہو آج ہم بھی تو آج ہم نہیں

نشّہ سنبھالے ہے مجھے بہکے ہوئے قدم نہیں

قادرِ دو جہاں ہے گو عشق کے دم میں دم نہیں

موت اگرچہ موت ہے موت سے زیست کم نہیں

کس نے کہا یہ تم سے خضر! آبِ حیات سم نہیں

کہتے ہو دہر کو بھرم مجھ کو تو یہ بھرم نہیں

اب نہ خوشی کی ہے خوشی غم بھی اب تو غم نہیں

میری نشست ہے زمیں خلد نہیں ارم نہیں

اور ہی ہے مقامِ دل دیر نہیں حرم نہیں

قیمتِ حُسنِ دو جہاں کوئی بڑی رقم نہیں

عہدِ وفا ہے حُسنِ یار قول نہیں قسم نہیں

لیتے ہیں مول دو جہاں دام نہیں درم نہیں

صوم و صلوٰۃ سے فراق

میرے گناہ کم نہیں

○

لطف نہیں کرم نہیں — جور نہیں ستم نہیں
اب نہیں روئے مہ چکاں — گیسوئے خم بہ خم نہیں
بر سرِ عالمِ وجود — کون سی شے عدم نہیں
یوں ہی نکل گئی اک آہ — رنج نہیں الم نہیں
کیا مری زندگی تری — بھولی ہوئی قسم نہیں
قائلِ حسنِ دلفریب — آپ نہیں کہ ہم نہیں
ہیں ترا مورِ عتاب — اس سے بڑا کرم نہیں
عالمِ حسنِ محضِ یار — عالمِ کیف و کم نہیں
جس کے لئے غزل کہوں — ایسا کوئی صنم نہیں
کب ہر سازِ کائنات — عالمِ زیر و بم نہیں
کب کوئی آہوئے جمیل — مائلِ عزمِ رم نہیں
مظہرِ دو جہاں ہوں میں — عشق ہوں جامِ جم نہیں
رقصِ شرر سے دیدیا — زندگی اُمم نہیں
ہاں کوئی اور ہی قسم — کھائی ہوئی قسم نہیں
آج بہت اُداس ہوں — یوں کوئی خاص غم نہیں

ہائے یہ بیخودیٔ غم آئے جو وہ تو ہم نہیں
غالب و دبیر و مصحفی !
ہم بھی فراق کم نہیں

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا
پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیث دگراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں !
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزم حیات
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

لاکھ کر جور و ستم لاکھ کر احسان و کرم

تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جدا ہوتا ہے

آستینوں میں لئے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

عشقِ افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت

وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن

آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

نظر آجاتے ہیں تم کو تو بہت نازک بال

دل مرا کیا وہی اے شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی

پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

آج بھی صید گہِ عشق میں حسنِ سفاک

لئے ابرو کی لچکتی سی کماں ہے کہ جو تھا

پھر تری چشمِ سخن سنج نے چھیڑی کوئی بات

وہی جادو وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

○

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

جادو سے جن کے راز بنے سامنے کی بات
ان آنکھوں کے دلوں پہ کھلیں کیا معاملات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ سکی جن سے ایک رات

کب تک رہے گی آنکھ نری سازِ بے صدا
ہاں ٹوٹ جائے اب یہ سکوتِ نظر تو بات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی غم تھا ترا ڈھل چکی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیا کے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

عشاق نے سرے سے بدل دیں مشیتیں
جو ہو سکا وہ کر گئے اب اُس کے آگے بات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں ہوئے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

اس جا تری نگاہ مجھے لے گئی جہاں — یعنی ہو جیسے سانس بہ ہیجان کائنات

کیا نیند آئے اُس کو جسے جاگنا نہ آئے — جو دن کو دن کرے وہ کرے رات کو بھی رات

دریا کے مد و جزر بھی پانی کے کھیل ہیں — ہستی ہی کے کرشمے ہیں کیا موت کیا حیات

اہلِ رضا میں شانِ بغاوت بھی ہو ذرا — اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات

ہم اہلِ دل ہیں چشمِ کرم سے بھی بے نیاز — سُن اے نگاہِ یار اب آ کر پڑی ہے بات

ہم اہلِ غم نے رنگِ زمانہ بدل دیا — کوشش تو کی سبھی نے مگر بن پڑی کی بات

پیدا کرے زمیں نئی آسماں نیا — اتنا تو لے کوئی اثر دورِ کائنات

اُٹھ بندگی سے مالکِ تقدیر بن کے دیکھ — کیا وسوسہ عذاب کا کیا کاوشِ نجات

شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں — چونکا رہے ہیں اُن کو بھی میرے توہمات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

لب جاناں ہیں پھر تبسم ریز
ہو گئی نبضِ کائنات بھی تیز

نگہ ناز سے بھی ساز نہ چھیڑ
یہ بھی ہے اک صدائے درد انگیز

ہیں وہی پردہ دار صبر و سکوں
خامشی جن کی ہے قیامت خیز

کیجئے کیا جو ہو یہ صورتِ حال
عشق بے تاب حسن کم آمیز

رخصت اے ملّتِ کہن کہ ترا
ہو گیا جام زندگی لبریز

کشش حسنِ یار عالمگیر
عشق کو اپنی ذات سے بھی گریز

اُف سیہ کاریاں نگاہوں کی
آہ انداز گیسوئے شب ریز

دور انسانیت کی شان تو دیکھ
گرد ہے آج سطوتِ چنگیز

لے اُڑی کائنات برق جمال
توسنِ ناز کو نہ کر مہمیز

ہجر اک درد انبساط آگیں
وصل بھی اک نشاطِ غم آمیز

دیکھ سینے میں پڑ نہ جائے لکیر
ہے یہ صہبائے عشق تند اور تیز

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی[1] آہستہ اور کتنی تیز

---

[1] انقلاب کی شام کو کوئی چیز انقلاب سے زیادہ غیر متوقع نہیں ہوتی (اناتول فرانس)

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

جھلکتی ہے کھنچی شمشیر میں نئی دُنیا
حیات و موت کے ملتے نہیں ہیں آج دماغ

حریف سینۂ مجروح و آتشِ غمِ عشق
نہ گُل کی چاک گریباں نہ لالے کے داغ

وہ جن کے حال میں لَو دے اُٹھے غمِ فردا
وہی ہیں انجمنِ زندگی کے چشم و چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

جو تہمتیں نہ اُٹھیں اک جہاں سے اُن کو سمیٹ
گناہگارِ محبت نکل گئے بے داغ

نئی زمین، نیا آسمان، نئی دُنیا!
سُنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ

جہانِ راز ہوئی جا رہی ہے آنکھ تری
کچھ اس طرح وہ دلوں کا لگا رہی ہے سراغ

زمانہ کود پڑا آگ میں یہی کہہ کر
کہ خون چاٹ کے ہو جائے گی یہ آگ بھی باغ

نگاہ مطلعِ نو پر ہیں اک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراقؔ بزمِ چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

کچھ اشارے تھے جنہیں دُنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
اس نگاہِ آشنا کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ غیر اپنی ہی نظر میں ہو گئے
واہ ری غفلت تجھے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ دل کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

پردۂ آزردگی میں تھی وہ جانِ التفات
جس ادا کو رنجشِ بیجا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کیا کہیں الفت میں رازِ بے حسی کیونکر کھلا
ہر نظر کو تیری درد افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بے نیازی کو تری پایا سراسر سوز و درد
تجھ کو اک دُنیا سے بیگانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

انقلابِ پے بہ پے ہر گردش و ہر دور میں
اس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بھول بیٹھی وہ نگاہِ ناز عہدِ دوستی
اس کو بھی اپنی طبیعت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم

صاف الگ ہم کو جنونِ عاشقی نے کر دیا
خود کو تیرے درد کا پردا سمجھ بیٹھے تھے ہم

کان بجتے ہیں محبت کے سکوتِ ناز کو
داستاں کا ختم ہو جانا سمجھ بیٹھے تھے ہم

باتوں میں پیامِ مرگ بھی آ ہی گیا
ان نگاہوں کو حیات افزا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اب نہیں تابِ سپاسِ حُسن اس دل کو جسے
بے قرارِ شکوۂ بیجا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک دُنیا درد کی تصویر نکلی عشق کو
کوہکن اور قیس کا قصہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حُسن کو اک حُسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دکھا کے رہ گئیں
ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں

حسنِ نظر فریب میں کس کو کلام تھا مگر
تیری ادائیں آج تو دل میں سما کے رہ گئیں

تب کہیں کچھ پتہ چلا صدق خلوص حسن کا
جب وہ نگاہیں عشق سے باتیں بنا کے رہ گئیں

تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے
فصلیں بہار کی جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں

پوچھ نہ ان نگاہوں کی طرفہ کرشمہ سازیاں
فتنے سلا کے رہ گئیں فتنے جگا کے رہ گئیں

تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدائے درد پر
اُن کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں

اُف یہ زمیں کی گردشیں آہ یہ غم کی ٹھوکریں
یہ بھی تو بخت خفتہ کے شانے ہلا کے رہ گئیں

اور تو اہل درد کو کون سنبھالتا بھلا!
ہاں تیری شادمانیاں اُن کو رُلا کے رہ گئیں

یاد کچھ آئیں اس طرح بھولی ہوئی کہانیاں
کھوئے ہوئے دلوں میں آج درد اُٹھا کے رہ گئیں

سازِ نشاطِ زندگی آج لرز لرز اُٹھا
کس کی نگاہ عشق کا درد سنا کے رہ گئیں

تم نہیں آئے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں

جھوم کے پھر چلیں ہوائیں وجد میں آئیں پھر فضائیں
پھر تری یاد کی گھٹائیں سینوں پہ چھا کے رہ گئیں

قلب و نگاہ کی یہ عید، اُف یہ مآل قرب و دید
چرخ کی گردشیں تجھے مجھ سے چھپا کے رہ گئیں

پھر ہیں وہی اُداسیاں پھر وہی سونی کائنات
اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
کون سکون دے سکا غمزدگانِ عشق کو
بھیگتی راتیں بھی فراق آگ لگا کے رہ گئیں

○

ستاروں سے اُلجھتا رہا ہوں — شبِ فرقت بہت گھبرا رہا ہوں
ترے غم کو بھی کچھ بہلا رہا ہوں — جہاں کو بھی سمجھتا جا رہا ہوں
یقیں یہ ہے حقیقت کھل رہی ہے — گماں یہ ہے کہ دھوکے کھا رہا ہوں
اگر ممکن ہو لے لے اپنی آہٹ — خبر دو حُسن کو میں آ رہا ہوں
حدیں حسن و محبت کی ملا کر — قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہوں
خبر ہے تجھ کو اے ضبطِ محبت — ترے ہاتھوں میں لٹتا جا رہا ہوں
اثر بھی لے رہا ہوں تیری چُپ کا — تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں
بھرم تیرے ستم کا کھل چکا ہے — میں تجھ سے آج کیوں شرما رہا ہوں
اُنہیں میں راز ہیں گلباریوں کے — میں جو چنگاریاں برسا رہا ہوں
ترے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسوس — کہ تجھ سے دور ہوتا جا رہا ہوں

حدِ جور و کرم سے بڑھ چلا حسن
نگاہِ یار کو یاد آ رہا ہوں

جو اُلجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں
وہ گتھی آج تک سلجھا رہا ہوں

محبت اب محبت ہو چلی ہے
تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں

اجل بھی جن کو سن کر جھومتی ہے
وہ نغمے زندگی کے گا رہا ہوں

یہ سناٹا ہے میرے پاؤں کی چاپ
فراقؔ اپنی کچھ آہٹ پا رہا ہوں

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکونِ دلِ وحشی کا مقام
کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

"ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں"
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

آہ! یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

نہیں ہیں پھول تو خاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
خزاں میں رفتہ بہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

ہزاروں شمس و قمر پہلوؤں میں ہیں جن کے
اُن اہلِ دل کے غباروں کو چھیڑ سکتا ہوں

زماں مکاں ہیں شگفتہ نگاہِ شاعر سے
تمام اُداس نظاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

کچھ اور رد کئے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی
دبے دبے سے شراروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نگاہِ شوق سے سازِ جمال بول اُٹھے
میں اس رباب کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اگر عنایتِ خوباں ہے زندگی کا مدار
تو زندگی کے سہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

تمام رمز شناروں بہ سادگیٔ نگاہ
تری نظر کے اشاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اشارہ ہے یہ ترے زیرِ لب تبسم کا
نگاہِ ناز کے ماروں کو چھیڑ سکتا ہوں

جو تیرے گیسوئے پُر خم سے کھیل بھی نہ سکیں
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراقِ غم بھی مرا ہے حریفِ زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

○

طرزِ آتیر

فرقت کی غمگیں راتوں کو یادیں تیری رو لیں ہیں
تاروں کو جب نیند آئے ہے ہم بھی گھڑی بھر سو لیں ہیں

ساقی بھلا کہاں قسمت میں اب وہ چھلکتے پیمانے
ہم یادوں کے جام چوم کے سوکھے ہونٹ بھگو لیں ہیں

فطرت کی وہ آنکھ مچولی دید کے قابل ہوئے ہے
حائلِ راز میں کلیاں آنکھیں بند کریں ہیں کھولیں ہیں

بے قصور منصور کو ناحق دار و رسن پر کھینچو ہو
لوگو کوئی اور نہیں یہ پردے سے ہم بولیں ہیں

لاکھ لاکھ ہم ضبط کریں ہیں دل ہے کہ اُمنڈا آوے ہے
ہمدم آنکھیں بھر آئیں ہیں نام بھی اس کا جو لیں ہیں

پتہ پتہ بوٹا بوٹا وجد کرے ہے گلشن میں
جب مشرق میں شفق پھوٹے ہے نرم ہوائیں ڈولیں ہیں

یہ بھی تُلی میزانِ نظر ہے کیا مجال جو فرق پڑے
آنکھوں آنکھوں میں وہ دلوں کو رتی رتی تولیں ہیں

حُسن کے ہاتھوں جب کہیں جاکر کوئی سُرخ رو ہووے ہے
اہلِ وفا پہلے اپنا مُنہ اپنے لہو سے دھولیں ہیں

اب اکثر بیمار رہیں ہیں کہیں نہیں نکلیں ہیں فراقؔ
حال چال لینے اُن کے گھر کبھو کبھو ہم ہولیں ہیں

نورس غنچے پنکھڑیوں کی نازک گرہیں کھولیں ہیں
یا اُڑ جانے کو رنگ و بو گلشن میں پر تولیں ہیں

تارے آنکھیں جھپکاویں ہیں ذرہ ذرہ سوئے ہے
تم بھی سنو یارو! شب میں سنّاٹے کچھ بولیں ہیں

ہم ہوں یا قسمت ہوں ہماری دونوں کو ایک ہی کام ملا
قسمت ہم کو رولیوے ہے ہم قسمت کو رولیں ہیں

جو مجھ کو بدنام کرے ہیں وے کاش اتنا سوچ سکیں
میرا پردا کھولیں ہیں یا اپنا پردا کھولیں ہیں

یہ قیمت بھی ادا کریں ہیں ہم بدرستی ہوش وحواس
تیرا سودا کرنے والے دیوانہ بھی ہولیں ہیں

تیرے غم کا پاس ادب ہے کچھ دنیا کا خیال بھی ہے
سب سے چھپا کے درد کے مارے چپکے چپکے رولیں ہیں

فطرت کا قائم ہے توازن عالم حسن و عشق میں بھی
اس کو اتنا ہی پاویں ہیں خود کو جتنا کھولیں ہیں

آب و تاب اشعار نہ پوچھو تم بھی آنکھیں رکھو ہو
یہ جگ مگ بیتوں کی دمک ہے یا ہم موتی رولیں ہیں

ایسے میں یاد تو آئے ہے انجمن مے رندوں کو
رات گئے گردوں پہ فرشتے باب گنہ کھولیں ہیں

صدقے فراق اعجاز سخن کے کیسے اڑا لی یہ آواز
ان غزلوں کے پردوں میں تو میر کی غزلیں بولیں ہیں

اب اکثر چُپ چُپ سے رہیں ہیں یونہی کبھو لب کھولیں ہیں
پہلے فراقؔ کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولیں ہیں

دن میں ہم کو دیکھنے والو اپنے اپنے ہیں اوقات
جاؤ نہ تم ان خشک آنکھوں پر ہم راتوں کو رو لیں ہیں

فطرت میری عشق و محبت قسمت میری تنہائی
کہنے کی نوبت ہی نہ آئی ہم بھی کسو کے ہولیں ہیں

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولیں ہیں

باغ میں وہ خواب آور عالم موجِ صبا کے اشاروں پر
ڈالی ڈالی نورس پتّے سہج سہج جب ڈولیں ہیں

اُف وہ لبوں پر موجِ تبسم جیسے کروٹیں لیں کوندے
ہائے وہ عالمِ جنبشِ مژگاں جب فتنے پر تولیں ہیں

نقش و نگارِ غزل میں جو تم یہ شادابی پاؤ ہو
ہم اشکوں میں کائنات کے نوکِ قلم کو ڈبو لیں ہیں

ان راتوں کو حریمِ ناز کا اک عالم ہوئے، ندیم
خلوت میں وہ نرم انگلیاں بندِ قبا جب کھولیں ہیں

غم کا فسانہ سننے والو آخرِ شب آرام کرو
کل یہ کہانی پھر چھیڑیں گے ہم بھی ذرا اب سولیں ہیں

ہم لوگ اب تو اجنبی سے ہیں کچھ تو بتاؤ حال فراق
اب تو تمہیں کو پیار کریں ہیں، اب تو تمہیں سے بولیں ہیں

○

ہم سے فراق اکثر چھپ چھپ کر پہروں پہروں روؤ ہو
وہ بھی کوئی ہم جیسا ہے کیا تم اس میں دیکھو ہو

جن کو اتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے
ان کو مٹے تو مدت گذری نام و نشاں کیا پوچھو ہو

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں یاد اتنا کیوں آؤ ہو

کیا غمِ دوراں کی پرچھائیں تم پر بھی پڑ جائے ہے
کیا یاد آ جائے ہے یکایک کیوں اُداس ہو جاؤ ہو

جھوٹی شکایت جو بھی کروں، ہو پلک دیپ جل جائیں ہیں
تم کو چھیڑے بھی کیا، تم تو ہنسی ہنسی ہیں رو دو ہو

غم سے خمیرِ عشق اُٹھا ہے حسن کو دیویں کیا الزام
اُس کے کرم پر اتنی اُداسی دل والو کیا چاہو ہو

ایک شخص کے مرجانے سے کیا ہو جائے ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئیں ہیں پیدا، پچھتاؤ گے دیکھو ہو

اتنی وحشت، اتنی وحشت صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو، ہیں نہ شکاری، دور اتنا کیوں بھاگو ہو

میرے نغمے کس کیلئے ہیں، خود مجھ کو معلوم نہیں!
کبھی نہ پوچھو یہ شاعر سے تم کس کا گُن گاؤ ہو

پلکیں بند، السائی زُلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو

اتنے تپاک سے مجھ سے ملو ہو، پھر بھی یہ خیریت کیوں
تم جیسے یاد آؤ ہو برابر میں ہوں وہی تم بھولو ہو

کبھی بنا دو ہو سینے کو پھولو ں سے رشکِ گلزار
کبھی رنگ رُخ بن کر تم یاد آتے ہی اُڑ جاؤ ہو

گاہ ترس جائیں ہیں آنکھیں رسجل روپکے درشن کو
گاہ نیند بن کر راتوں کو نین پٹوں میں آؤ ہو

اس دُنیا ہی میں سُنیں ہیں اک دُنیائے محبت بھی
ہم بھی اس جانب جاویں ہیں بولو تم بھی آؤ ہو

بہت دنوں میں یاد کیا ہے بات بنائیں کیا اُن سے
جیون ساتھی دکھ پوچھیں ہیں کس کو ہمیں تم سوچو ہو

چُپ چُپ سی ہے فضائے محبت کچھ نہ کہے ہے خلوتِ راز
نرم اشارِ دل سے آنکھوں کے بات کہاں پہنچاؤ ہو

ابھی اسی کا انتظار تھا اور کتنا اے اہلِ وفا
چشمِ کرم جب اُٹھنے لگی ہے تو اب تم شرماؤ ہو

غم کے ساز پہ چنچل اُنگلیاں کھیل رہی ہیں ست راگی
جن کا سکوت، سکونِ ابد ہے وہ پردے کیوں چھیڑو ہو

کچھ تو بتاؤ رنگ روپ بھی اس کا اے اہلِ نظر
تم تو اس کو جب دیکھو ہو، دیکھتے ہی رہ جاؤ ہو

اکثر گہری سوچ میں اُن کو کھایا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراق کا کچھ روز دن ہے جو عالم کیا پوچھو ہو

وعدے کی رات مرحبا آمدِ یارِ مہرباں
زلف سیہ شب فشاں، عارضِ نازمہ چکاں
برقِ جمال میں تری خفتہ سکونِ بے کراں
اور مرا دلِ تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں
چھیڑ کے داستانِ غم اہلِ وطن کے درمیاں
ہم ابھی بیچ ہی میں تھے اور بدل گئی زباں

اپنی غزل میں ہم جسے کہتے رہے ہیں بارہا
وہ ہی تری داستاں کہاں وہ تو ہے زیبِ داستاں
کوئی نہ کوئی بات ہے اُس کے سکوتِ یاس میں
بھول گیا ہے سب گلے آج تو عشقِ بدگماں

رات کمال کر گئیں عالمِ کربِ درد میں
دل کو مرے سُلا گئیں تیری نظر کی لوریاں

سرحدِ غیب تک تجھے صاف ملیں گے نقشِ پا

پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں تیری لئے کہاں کہاں

کہتے ہیں میری موت پر اُس کو بھی چھین ہی لیا

عشق کو مدتوں کے بعد ایک ملا تھا ترجمان

رنگ جما کے اُٹھ گئی کتنے تمدنوں کی بزم

یاد نہیں زمین کو بھول چکا ہے آسماں

عارضیت کا سوز بھی دیکھ تو سوزِ عارضی

بیتے ہوئے جُگوں سے پوچھ کس کو ثبات ہے یہاں

کوئی نہیں جو ساتھ دے تیری حریمِ راز تک

بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

جس کو بھی دیکھیے وہی بزم میں ہے غزل سرا

چھڑ گئی داستانِ دل پھر بحدیثِ دیگراں

بیت گئے ہیں لاکھ جُگ سوئے وطن چلے ہوئے

پہنچی ہے آدمی کی ذات چار قدم کشاں کشاں

پاؤں سے فرق ناز تک برقِ تبسمِ نشاط

محسن جسن غردش کو دیکھ جہاں سے گلستاں

دادِ سخنوری ملی ابروئے ناز اُٹھ گئے

جیسے ہی داستانِ دل حُسن کبھی کہہ اُٹھے کہ ہاں

جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے

رات وہ دستِ ناز میں جامِ نشاطِ ارغواں

رازِ وجود کچھ نہ پوچھ صبحِ ازل سے آجتک

کتنے وجود چل بسے کتنے گذر گئے گماں

نرگسِ نازم حیا زہیں ہے جس کی کائنات

چھٹکی ہیں ناوکِ نگاہ جُتی بھویں کماں کماں

تجھ سے یہی کہیں گی کیا گذری ہے مجھ پہ اک نظر

جو میری آستیں پہ ہیں تیرے غموں کی سُرخیاں

دور بہت زمین سے پہنچی ہے اک کرن کی چوٹ

نیم تبسم خفی! رہ گئیں بس کے بجلیاں

کتنے تصورات کے کتنے ہی واردات کے

لعل و گہر لٹا گیا دل ہے کہ گنجِ شائیگاں

سینوں میں درد بھر دیا چھیڑ کے داستانِ حُسن

آج تو کام کر گئی عشق کی عمرِ رائیگاں

آہ! فریبِ رنگ و بو اپنی شکست آپ ہے

بعد نظارۂ بہار بڑھ گئیں اور اُداسیاں

اے مری شامِ انتظار کون یہ آ گیا لئے

زلفوں میں ایک شب دراز، آنکھوں میں کچھ کہانیاں

مجھ کو فراقؔ یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست

پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں و مہ چکاں

نظمیں

رقصِ شب تاب

رات ہنس دیتی ہے با دیدۂ پُر نم ساقی
تتّیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
جگمگا اُٹھتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی
جب پیالوں میں چراغوں کی لویں ڈھلتی ہیں

تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی
تا بہ نُہ گنبدِ افلاک کھنک جاتی ہے
چنگ سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی
تیرگی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

آتی ہیں مدبھرے سنگیت کی لپٹیں ساقی
آگ آکاش کے سینے میں وہ دہکاتی ہوئی
اُنگلیاں ساز کے پردوں میں رواں ہیں ساقی
اس جواں رات کے دل کی کسک اُکساتی ہوئی

پھول گرتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی
سازکی آنچ پہ رقصندہ شراروں کا گماں
گرمیٔ رقص سے دمکے ہوئے پیکر ساقی
وہ پسینے کی جھلک دیتی ہوئی کاہ کشاں

رقصِ شب تاب سے ہر عضو درخشاں ساقی
برق سیال لچکتی ہوئی شریانوں میں
جیسے ہو جائے سرِ شام چراغاں ساقی
جسمِ رنگیں کے لہکتے شفقستانوں میں

رقص میں پیکرِ نازک کا لچکنا ساقی
انگ کے لوچ میں تحلیل راگنیاں جھومتی ہیں
یہ مدُھر بول، یہ کوندوں کا لپکنا ساقی
لالہ گوں ہونٹوں کو نغموں کی لویں چومتی ہیں

روپ سے پھوٹتا ہے نور کا تڑکا ساقی
کنول اُن نازنیں ہاتھوں کے لُٹاتے ہوئے جبس
جیسے دو چاندوں سے امرت کی ہو برکھا ساقی
ناچتے وقت چھلک جاتا ہے یوں جوبن رس

رس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی
سات رنگوں کی سجل قوس یہ باہوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھما چھم ساقی
رُخِ گُل رنگ پہ سنگیت کی یہ تیز دمک

جام اُچھلتے ہیں لویں دیتی ہیں سرشار فضائیں
شعلے آواز کے سانچے میں یہاں ڈھلتے ہیں
آنکھیں جھپکاتی ہیں رہ رہ کے نم آلود ہوائیں
رقص کی شوخ اداؤں سے کنول جلتے ہیں

شعلے جب دھیرے سنگیت کے لو دیتے ہیں
جگمگا اُٹھتی ہے پیشانیِ دوراں ساقی
نغمے جب زیرِ فلک کانپ کے دم لیتے ہیں!
جھلملا اُٹھتا ہے تاروں کا چراغاں ساقی

یہ شب افروز نواؤں کی لپک اے ساقی
زندگی اپنی جوانی پہ ذرا اترائی ہوئی
نشۂ رقص میں چہروں کی دمک اے ساقی
جیسے آئینہ در آئینہ بہار آئی ہوئی

موہنی روپ کی سنگیت کا جادو ساقی

آئینہ زیر و بمِ نفس کا ہر عضوِ بدن

دلِ بیتاب بدلتے ہوئے پہلو ساقی

دیکھیے پڑتی ہے کس پر نگہہِ صاعقہ زن

گیت میں اندازِ جہانِ گذراں ہے ساقی

سُر کے پردوں سے کوئی دردِ نہاں اُٹھتا ہے

بزم میں عود کی موجوں کا سماں ہے ساقی

صاف لہرے سے سرنگی کے دھواں اُٹھتا ہے

رین سنگیت کے اب بھیگ چلے ہیں شعلے

سرنگوں سازِ گلے نور کے خم ہیں ساقی

انگلیاں تیری چٹخاتی ہے گیسو کھولے

برقِ آواز کی پلکیں بھی تو نم ہیں ساقی

رات لیتی ہے جماہی پر جماہی ساقی

ہر نظر جاگے ہوئے تاروں کی السائی ہوئی

چور کتنی ہے تری نیم نگاہی ساقی

مے میں ڈوبے ہوئے سنگیت کو نیند آئی ہوئی

بزمِ برشگال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے
آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
"زرّیں کمرے، کج کلہے، تنگ قبائے"
پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے
اک برق ادا شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں
گلہائے مہ و مہر کو پہلو میں دبائے
کوندا ہو گداز اُف یہ تبسّم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک تو جو ستاروں سے چرائے

لو دیتا ہوا صبحِ بہاراں کا ترنم
وہ نرمِ صباحت جو رچی بھیرویں گائے
وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
وہ حُسنِ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
وہ چہرۂ شاداب کہ اک خوابِ گلستاں
وہ موجِ نفس خوشبوؤں کو نیند سی آئے
سنگیت کے سینے میں چراغاں کرے آواز
انداز، دلِ ساز کی دھڑکن بھی نہ پائے
گھنگھور گھٹا کعبہ پہ منڈلائے، دلوں پر
پڑتے رہیں نمناک گھنی پلکوں کے سائے
حُسنِ عرق آلود چراغِ تہِ داماں
کافوری کنولِ چادرِ شبنم میں چھپائے
وہ نرم کلامی کہ سکوت آنکھ اُٹھا دے
آہستہ خرامی کہ فضا وجد میں آئے
وہ شوخیٔ محتاط کہ سجتے ہوئے انداز
دُنیا بھی نہ سہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

یکم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی؟

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

برقِ نگہ شوق کے صدقے کہ دلوں پر

بجلی بھی گرے حسن پہ بھی آنچ نہ آئے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے

رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

رنگین جوانی کی ادھر ٹوٹتی انگڑائی

تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے

وہ رنگ جو ہو جلوہ وہ نغمۂ جنت

وہ روپ حقیقت کو جو آئینہ دکھائے

زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات

روئے شفق آمیز سے پو پھوٹتی جائے

وہ کشف و کرامات درِ جلوہ نمائی

چادر سی نگاہوں سے سرکتی چلی جائے

کیوں تیرے غمِ ہجر میں نمناک ہیں پلکیں

کیوں یاد تری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اُترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گذری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

شاعر ہیں فراقؔ آپ بڑے پائے کے لیکن
رکھا ہے عجب نام کہ جو راس نہ آئے

○

آدھی رات

(۱)

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گُم شدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں ___ جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پڑا، چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
___ فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

تمولیوں کی دوکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگار کا پیڑ
دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
یہ موجِ نور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول
سپاہِ روس ہے اب کتنی دور برلن سے
جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو
چھلک رہی ہے خمِ غیب سے شرابِ وجود
فضائے نیم شبی نرگسِ خمار آلود
کنول کی چٹکیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

(۳)

یہ زمیں کا سیج، یہ سکمار، یہ سکومل گات
نین کمل کی جھپک کا مدھر روپ کا جادو
یہ رسمسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں
فلک پہ بکھرے ہوئے چاند اور ستاروں کی
چمکتی انگلیوں سے چھیڑ کے سازِ فطرت کے
ترانے جاگنے والے ہیں — تم بھی جاگ اٹھو

(۴)

شعاعِ مہر نے یوں ان کو چوم چوم لیا
ندی کے بیچ، کمدنی کے پھول کھل اٹھے
یہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا —
یہ چھائیں چھائیں سی رہ رہ کے ایک جھینگر کی
حنا کی ٹٹیوں میں نرم سرسراہٹ سی
فضا کے سینے میں خاموش سنسناہٹ سی

لٹوں میں رات کی دیوی کی تھرتھراہٹ سی
یہ کائنات اب اک نیند لے چکی ہو گی

(۵)

یہ محوِ خواب ہیں رنگین مچھلیاں تہِ آب
کہ حوضِ صحن میں اب اُن کی چشمکیں بھی نہیں
یہ سرنگوں ہیں سرِ شاخ پھول گڑھل کے
کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں
یہ چاندنی ہے کہ اُمڈا ہوا ہے رس ساگر
اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دُنیا میں

(۶)

قریب چاند کے منڈلا رہی ہے اک چڑیا
بھنور میں نور کے کروٹ سے جیسے ناؤ چلے
کہ جیسے سینۂ شاعر میں کوئی خواب پلے
وہ خواب سانچے میں جس کے نئی حیات ڈھلے

وہ خواب جس سے پُرانا نظامِ غم بدلے
کہاں سے آتی ہے بدمالتی لتا کی لپٹ
کہ جیسے سینکڑوں پریاں گلابیاں چھڑ کائیں
کہ جیسے سینکڑوں بن دیویوں نے جھولے پر
ادائے خاص سے اک ساتھ بال کھول دئے
لگے ہیں کان ستاروں کے جس کی آہٹ پر
اس انقلاب کی کوئی خبر نہیں آتی
دلِ نجوم دھڑکتے ہیں کان بجتے ہیں

(۷)

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات، یہ شبِ ماہ
یہ پُرسکوں یہ پُراسرار یہ اُداس سماں
یہ نرم نرم ہواؤں کے نیلگوں جھونکے
فضا کی اوٹ میں مُردوں کی گنگناہٹ ہے
یہ رات موت کی بے رنگ مسکراہٹ ہے

دھواں دھواں سے مناظر تمام نم دیدہ
خنک، دھندلکے کی آنکھیں بھی نیم خوابیدہ
ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن
حیات پردۂ شب میں بدلتی ہے پہلو
بجھا اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا!
مرے خیال میں اب ایک بج رہا ہوگا!

(۸)

گلوں نے چادرِ شبنم سے منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گذر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں

سکوتِ نیم شبی ہے انہیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

(۹)

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
نئے ستارے، نئی گردشیں، نئے دن رات
زمیں سے تا بفلک انتظار کا عالم
فضائے زرد میں، دھندلے غبار کا عالم
حیات موت نما انتشار کا عالم
ہے موجِ دود کہ دھندلی فضا کی نبضیں ہیں
تمام خستگی و ماندگی، یہ دورِ حیات
تھکے تھکے سے یہ تارے، تھکی تھکی سی یہ رات
یہ سرد سرد، یہ بےجان، پھیکی پھیکی چمک
نظامِ ثانیہ کی موت کا پسینا ہے لہ
خود اپنے آپ میں یہ کائنات ڈوب گئی
خود اپنے کوکھ سے پھر جگمگا کے ابھرے گی

لہ پہلا نظام جاگیرداری۔ دوسرا نظام سرمایہ داری۔ تیسرا نظام اشتراکیت (فراق)

بدل کے کیچلی جس طرح ناگ لہرائے

(۱۰)

خنک فضاؤں میں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
کہ آبگینوں پہ پڑتی ہے نرم نرم پھوار

یہ موجِ غفلتِ معصوم یہ خمارِ بدن
یہ سانس نیند میں ڈوبی یہ آنکھ مدماتی
اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

○

ہنڈولہ

دیارِ ہند تھا گہوارہ ــــــــ یاد ہے ہمدم؟
بہت زمانہ ہوا ــــــــ کس کے کس کے بچپن کا

اسی زمین پہ کھیلا ہے رام کا بچپن
اسی زمین پہ اُن ننھے ننھے ہاتھوں نے
کسی سمے میں دھنش بان کو سنبھالا تھا
اسی دیار نے دیکھی ہے کرشن کی لیلا
یہیں گھروندوں میں سیتا، سلوچنا، رادھا
کسی زمانہ میں گڑیوں سے کھیلتی ہوں گی
یہی زمیں، یہی دریا، پہاڑ، جنگل، باغ
یہی ہوائیں، یہی صبح و شام، سورج، چاند
یہی گھٹائیں، یہی برق و رعد و قوسِ قزح
یہیں کے گیت، روایات، موسموں کے جلوس

ہوا زمانہ کہ سدھارتھ کے تھے گھوارے
انہی میں آنکھ کھُلی تھی اشوک اعظم کی
انہی نظاروں میں بچپن کٹا تھا وکرم کا
سنا ہے بھرتری ہری بھی اُنہیں سے کھیلا تھا
بھرت،[1] اگست، کپل، ویاس، پاشی، کوٹلیہ
جنک وشسٹ، منو، والمیک، وشوامتر
کناد، گوتم ورااما، انج، کمارل بھٹ
مہنجوڈارو، ہڑپا کے اور اجنتا کے
بنانے والے یہیں بلموں سے کھیلے تھے
اسی ہنڈولے میں بھوبھوت، وکالیداس، کبھی
ہُمک ہُمک کے جو تُتلائے گنگنائے تھے
سرسوتی نے زبانوں کو اُن کی چوما تھا
یہیں کے چاند و سورج[2] کھلونے تھے اُن کے

---

[1] شکنتلا کا بیٹا جس کے نام کی رعایت سے یہ ملک "بھارت" کہلایا۔

[2] میں سلیقہ کے ساتھ ہندی الفاظ کے درمیان عطف لانا جائز رکھتا ہوں (فراق)

انہیں فضاؤں میں بچپن پلا تھا خسرو کا
اسی زمین سے اُٹھے تھے تان سین اور اکبر
رحیم و نانک و چیتنیہ اور چشتی نے
انہی فضاؤں میں بچپن کے دن گذارے تھے
اسی زمیں پہ کبھی شاہزادہ خرم
ذرا سی دل شکنی پر جو رو دیا ہوگا!
بھر آیا ننھا دلِ نازک تو کیا عجب اُس نے
ان آنسوؤں نے جھلک تاج کی بھی دیکھی ہو
اہلیا بائی، دمن، پدمنی و رضیہ نے
یہیں کے پیڑوں کی شاخوں میں ڈالے تھے جھولے
اسی فضا میں بڑھائی تھی پینگ بچپن کی
انہی نظاروں میں ساون کے گیت گائے تھے
اسی زمین پہ گھٹنوں کے بل چلے ہوں گے
ملک محمد و رس کھان اور تلسی داس
انہی فضاؤں میں گونجی تھی توتلی بولی
کبیرداس، ٹکارام، سور و میرا کی

اسی ہنڈ لے میں ودیاپتی کا کنٹھ کھلا

اسی زمین کے تھے لال میر و غالب بھی
ٹھمک ٹھمک کے چلے تھے گھروں کے آنگن میں

انیس، حالی، و اقبال اور وارث شاہ
یہیں کی خاک سے ابھرے تھے پریم چند و ٹیگور
یہیں سے اُٹھے تھے تہذیبِ ہند کے معمار

اسی زمین نے دیکھا تھا بال پن اُن کا
یہیں دکھائی تھیں ان سب نے بال لیلائیں
یہیں ہر ایک کے بچپن نے تربیت پائی!
یہیں ہر ایک کے جیون کا بال کانڈ کھُلا
یہیں سے اُٹھتے بگولوں کے ساتھ دوڑے ہیں
یہیں کی مست گھٹاؤں کے ساتھ جھومے ہیں
یہیں کی مست بھری برسات میں نہائے ہیں
لپٹ کے کیچڑ و پانی سے بچپنے اُن کے

اسی زمین سے اُٹھے وہ دیش کے ساونت
اُڑا دیا تھا جنہیں کمپنی نے توپوں سے

اسی زمین سے اُٹھی ہیں ان گنت نسلیں
پلے ہیں ہند ہنڈولے میں ان گنت بچے
بجھا ایسے کتنے ہی گم نام بچے کھیلے ہیں
مجھا ایسے کتنے ہی گم نام مرد و زن اُٹھے
اسی زمین سے اسی میں سپردِ خاک ہوئے
زمینِ ہند اب آرام گاہ ہے اُن کی
اس ارضِ پاک سے اُٹھیں بہت سی تہذیبیں
یہیں طلوع ہوئیں اور یہیں غروب ہوئیں
اسی زمین سے اُبھرے کئی علوم و فنون
فرازِ کوہ ہمالہ، یہ رودِ گنگ و جمن
اور اُن کی گود میں پروردہ کاروانوں نے
یہیں رموزِ خرامِ سکوں نما سیکھے
نسیمِ صبحِ تمدن نے بکھیر دی ابھری
یہیں وطن کے ترانوں کی وہ پویں پھوٹیں
وہ بے قرار سکون زا، ترنم سحری
وہ کپکپاتے ہوئے سوز و ساز کے شعلے

نعیمہ

انہی فضاؤں میں انگڑائیاں جو لے کے اُٹھے
لوؤں سے جن کے چراغاں ہوئی تھی بزمِ حیات
جنہوں نے ہند کی تہذیب کو ــــ زمانہ ہوا
بہت سے زاویوں سے آئینہ دکھایا تھا
اسی زمیں پہ ڈھلی ہے مری حیات کی شام
اسی زمین پہ وہ صبح مسکرائی ہے
تمام شعلہ و شبنم مری حیات کی صبح
سناؤں آج کہانی میں اپنے بچپن کی
دل و دماغ کی کلیاں ابھی نہ چٹکی تھیں
ہمیشہ کھیلتا رہتا تھا بھائی بہنوں میں
ہمارے ساتھ محلے کی لڑکیاں لڑکے
مچائے رکھتے تھے بالک اُدھم ہر ایک گھڑی
لہو ترنگ، اُچھل پھاند کا یہ عالم تھا
محلہ سر پہ اُٹھائے پھرے جدھر گزرے
ہمارے چہچہے اور شور گونجتے رہتے
چہار سمت محلے کے گوشے گوشے میں

فضائیں آج بھی لاریب گونجتی ہوں گی[ل]
اگرچہ دوسرے بچوں کی طرح تھا میں بھی
بظاہر اوروں کے بچپن سا تھا مرا بچپن
یہ سب سہی مرے بچپن کی شخصیت بھی تھی ایک
وہ شخصیت کہ بہت شوخ جس کے تھے خد و خال
ادا ادا میں کوئی شان انفرادی تھی
غرض کچھ اور ہی لچھن تھے میرے بچپن کے
مجھے تھا چھوٹے بڑوں سے شدید لگاؤ
ہر ایک پر میں چھڑکتا تھا اپنی ننھی سی جان
دل امنڈ آتا تھا ایسا کہ جی یہ چاہتا تھا
اٹھا کے رکھ لوں کلیجے میں اپنی دنیا کو
مجھے ہے یاد ابھی تک کہ کھیل کود میں بھی
کچھ ایسے وقفے پُر اسرار آ ہی جاتے تھے
کہ جن میں سوچنے لگتا تھا کچھ مرا بچپن
کئی معانیِ بے لفظ چھونے لگتے تھے
بطونِ غیب سے میرے شعورِ اصغر کو

ل آواز کبھی فنا نہیں ہوتی - فراق

ہر ایک منظرِ مانوس، گھر کا ہر گوشہ
کسی طرح کی ہو گھر میں سجی ہوئی ہر چیز
مرے محلے کی گلیاں، مکاں در و دیوار
چبوترے، کنوئیں، کچھ پیڑ جھاڑیاں، بیلیں
وہ پھیری والے کئی، اُن کے بھانت بھانت کے بول
وہ جانے بوجھے مناظر، وہ آسمان و زمین
بدلتے وقت کا آئینہ گرمی و خنکی
غروبِ مہر میں رنگوں کا جاگتا جادو
شفق کے شیش محل میں گدازِ پنہاں سے
جواہروں کی چٹانیں سی کچھ پگھلتی ہوئی
شجر حجر کی وہ کچھ سوچتی ہوئی دنیا
سہانی رات کی مانوس رمزیت کا فسوں
علی الصباح افق کی وہ تھرتھراتی بھوئیں
کسی کا جھانکنا آہستہ پھوٹتی پو سے
وہ دوپہر کا سمے درجۂ تپش کا چڑھاؤ
تھکی تھکی سی فضا میں وہ زندگی کے آثار

ہوا کی بنسیاں بنسواڑیوں میں بجتی ہوئی
وہ دن کے بڑھتے ہوئے سائے سہ پہر کا سکون
سکوت شام کا جب دونوں وقت ملتے ہیں
غرض جھلکتے ہوئے سرسری مناظر پر
مجھے گمان پرستانیت کا ہوتا تھا
ہر ایک چیز کی وہ خواب ناک اصلیت
مرے شعور کی چلمن سے جھانکتا تھا کوئی
لئے ربوبیتِ کائنات کا احساس
ہر ایک جلوے میں غیب وشہود کا وہ ملاپ
ہر ایک نظارہ اک آئینہ خانۂ حیرت
ہر ایک منظرِ مانوس ایک حیرت زار
کہیں رہوں، کہیں کھیلوں کہیں پڑھوں لکھوں
مرے شعور پہ منڈلاتے تھے مناظرِ دہر
میں اکثر اُن کے تصور میں ڈوب جاتا تھا
وفورِ جذبہ سے ہو جاتی تھی مژہ پُرنم
مجھے یقین ہے ان عنصری مناظر سے

کہ عام بچوں سے لیتا تھا میں زیادہ اثر
کسی سمے مری طفلی رہی نہ بے پروا
نہ چھو سکی مری طفلی کو غفلتِ طفلی
یہ کھیل کود کے لمحوں میں ہوتا تھا احساس
دعائیں دیتا ہو جیسے مجھے سکوتِ دوام
کہ جیسے ہاتھ ابد رکھ دے دوشِ طفلی پر
ہر ایک لمحہ کے رخنوں سے جھانکتی صدیاں
کہانیاں جو سنوں اُن میں ڈوب جاتا تھا
کہ آدمی کے لیے آدمی کی جگ بیتی ......
سے بڑھ کے کون سی شے اور ہو ہی سکتی ہے
انہی فسانوں میں پنہاں تھے زندگی کے رموز
انہی فسانوں میں کھلتے تھے رازہائے حیات
انہی فسانوں میں ملتی تھیں زیست کی قدریں
رموزِ بیش بہا [illegible] آدمیت کے
کہانیاں تھیں کہ صد درس گاہِ رقتِ قلب
ہر اک کہانی میں شائستگیِ غم کا سبق!

وہ عنصر آنسوؤں کا داستانِ انساں میں
وہ نل دمن کی کتھا، سرگذشتِ ساوتری
شکنتلا کی کہانی، بھرت[1] کی قربانی
وہ مرگِ بھیشم پتامہ، وہ سیج تیروں کی
وہ پانچ پانڈوں کی سرگ یاترا کی کتھا
وطن سے رخصت سدھارتھ، رام کا بن باس
دفا کے بعد بھی سیتا کی وہ جلا وطنی
وہ رات کی رات سری کرشن کو اُٹھائے ہوئے
بلا کی قید سے بسدیو کا نکل جانا
غم آفرین کہانی وہ ہیر رانجھا کی
شعورِ ہند کے بچپن کی یادگارِ عظیم
کہ ایسے ویسے تخیل کی سانس اُکھڑ جائے
کئی محیرِ ادراک دیومالائیں!
ہت اوپدیش کے قصے کتھا، سرت ساگر
کروڑوں سینوں میں وہ گونجتا ہوا آلھا
میں پوچھتا ہوں کسی اور ملک والوں سے

[1] یہاں بھرت سے مراد رام کے بھائی سے ہے ـــــ فراق۔

کہانیوں کی یہ دولت یہ بے بہا دولت
فسانے دیکھ لو ان کے، نظر بھی آتی ہے
میں پوچھتا ہوں کہ گہوارے اور قوموں کے
بسے ہوئے ہیں کہیں ایسی داستانوں سے؟
کہانیاں جو میں سُنتا تھا اپنے بچپن میں
مرے لئے وہ نہ تھیں محض باعثِ تفریح
فسانوں سے مرے بچپن نے سوچنا سیکھا
فسانوں سے مجھے سنجیدگی کے درس ملے
فسانوں میں نظر آتی تھی مجھ کو یہ دُنیا
غم و خوشی میں رچی پیار میں بسی ہوئی
فسانوں سے مرے دل نے گھلاوٹیں پائیں
یہی نہیں کہ مشاہیر ہی کے افسانے
ذرا سی عمر میں کرتے ہوں مجھ کو متاثر
محلے ٹولے کے گمنام آدمیوں کے!
کچھ ایسے سننے میں آتے تھے واقعاتِ حیات
جو یوں تو ہوتے تھے "فرسودہ اور معمولی"

مگر تھے آئینۂ اخلاص اور شرافت کے
یہ چند آئی گئی باتیں ایسی باتیں تھیں
کہ جن کی اوٹ چمکتا تھا درد انسانی
یہ واردات نہیں رزمیۂ حیات کے تھے
غرض کہ یہ ہیں مرے بچپنے کی تصویریں
یہ میری ماں کا ہے کہنا کہ جب میں بچہ تھا
نہ تیم اور کبھی کچھ خط و خال ہیں ان کے
ہیں ایسے آدمی کی گود میں نہ جاتا تھا
جو بد قوارہ ہو عیبی ہو یا ہو بد صورت
مجھے بھی یاد ہے نو دس برس کا ہی میں تھا
تو مجھ پہ کرتا تھا جادو سا حُسنِ انسانی
کچھ ایسا ہوتا تھا محسوس جب میں دیکھتا تھا
شگفتہ رنگ، تر و تازہ روپ والوں کا
کہ اُن کی آنچ مری ہڈیاں گلا دے گی
اک آزمائشِ جاں تھی کہ تھا شعورِ جمال
اور اُس کی نشتریت اس کی استخواں سوزی

غم و نشاط، لگاوٹ، محبت و نفرت
اک انتشار، سکوں، اضطراب، پیار، عتاب
وہ بے پناہ ذکی الحسی وہ حلم و غرور
کبھی کبھی وہ بھرے گھر میں حسِ تنہائی
وہ وحشتیں مری ماحول خوشگوار میں بھی
مری سرشت میں ضدین کے کئی جوڑے
شروع ہی سے تھے موجود آب و تاب کے ساتھ
مرے مزاج میں پنہاں تھی اک جدلیت
رگوں میں چھوٹتے رہتے تھے بے شمار انار
ندیم یہ ہیں مرے بال پن کے کچھ آثار
وفورِ شدتِ جذبات کا یہ عالم تھا
کہ کوندیں جست کریں دل کے آبگینے میں
وہ بچپنا جسے برداشت اپنی مشکل ہو
وہ بچپنا جو خود اپنے پہ تیوریاں سی چڑھائے
ندیم ذکرِ جوانی سے کانپ جاتا ہوں
جوانی آئی دبے پاؤں اور یوں آئی

کہ اُس کے آتے ہی بگڑا بنا بنایا کھیل
وہ خواہشات کے جذبات اُمڈتے ہوئے
وہ ہونکتے ہوئے بے نام آگ کے طوفان
وہ پھوٹتا ہوا اجوالا اکھی جوانی کا
رگوں میں اُٹھتی ہوئی آندھیوں کے وہ جھٹکے
کہ جو توازنِ ہستی جھنجھوڑ کے رکھ دیں
وہ زلزلے کہ پہاڑوں کے پیر اُکھڑ جائیں
بلوغیت کی وہ ٹیسیں، وہ کرب نشو و نما
اور ایسے میں مجھے بیاہا گیا بھلا کس سے
جو ہو نہ سکتی تھی ہرگز مری شریکِ حیات
ہم ایک دوسرے کے واسطے بنے ہی نہ تھے
سیاہ ہو گئی دُنیا مری نگاہوں میں
وہ جس کو کہتے ہیں شادیِ خانہ آبادی
مرے لئے ہوئی شادیِ خانہ بربادی
مرے لئے وہ بنی بیوگی جوانی کی
لُٹا سہاگ مری زندگی کا مانڈو میں

ندیم کہا گئی مجھ کو نظر جوانی کی
بلا سے جان مجھے ہو گیا شعورِ جمال
تلاشِ مشغلۂ اُلفت سے یہ ہوا حاصل
کہ نفرتوں کا اگن کنڈ بن گئی ہستی!
وہ حلق و سینہ و رگ رگ میں بے پناہ چُھپا
ندیم! جیسے نگل لی ہو میں نے ناگ پھنی
زعشق زادم و عشقم بکشت زار و دریغ
خبر نہ برد بہ رستم کسے کہ سہرابم
نہ پوچھ عالمِ کام و دہن ندیم مرے
ثمرِ حیات کا جب راکھ بن گیا منہ میں
میں جلتی پھرتی چتا بن گیا جوانی کی
میں کاندھا دیتا رہا اپنے جیتے مُردوں کو
یہ سوچتا تھا کہ اب کیا کروں کہاں جاؤں
بہت سے اور مصائب[1] بھی مجھ پہ ٹوٹ پڑے

---

[1] والد، بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی موت کی طرف اشارہ ہے۔ فراق

میں ڈھونڈھنے لگا سچی چھوٹی پناہ
تلاشِ حُسن میں شعر و ادب میں دوستی میں
ڈُھونڈھی صدا سے محبت کی بھیک مانگی ہے
نئے سرے سے سمجھنا پڑا ہے دُنیا کو
بڑے جتن سے سنبھالا ہے خود کو میں نے ندیم
مجھے سنبھلنے میں چالیس سال گذرے ہیں
مری حیات تو وِش پان[1] کی کتھا ہے ندیم
میں زہر پی کے زمانے کو دے سکا امرت
نہ پوچھ میں نے جو زہرا یہ حیات پیا
کوئی اُتار لے اُس کو تو دھجیاں اُڑ جائیں
مگر ہوں دل سے میں اس کے لئے سپاس گذار
لرزتے ہاتھوں سے دامنِ خلوص کا نہ چھُٹا
بچا کے رکھی گئی میں نے امانتِ طفلی
اُسے نہ چھین سکی مجھ سے دستبردِ شباب
بقولِ شاعرِ ملکِ فرنگ ہر جیسپر۔
خرد اپنے عہدِ جوانی کا باپ ہوتا ہے

[1] مہادیو کے زہر پینے کی کتھا۔ فراقؔ

یہ کم نہیں ہے کہ طفلیٔ رفتہ چھوڑ گئی
دلِ حزیں میں کئی چھوٹے چھوٹے نقشِ قدم
مری انا کی رگوں میں پڑے ہوئے ہیں ابھی
نہ جانے کتنے بہت نرم انگلیوں کے نشاں
ہنوز وقت کے بے درد ہاتھ کر نہ سکے
حیاتِ رفتہ کی زندہ نشانیوں کو فنا
زمانہ چھین سکے گا نہ میری فطرت سے
مری صفا، مرے تحت الشعور کی عصمت
تخیلات کی دوشیزگی، ردِ عمل
جوان ہو کے بھی بے لوث طفل وش جذبات
سیانا ہونے پہ بھی یہ جبلتیں میری
یہ سرخوشی و غمِ بے ریا یہ قلبِ گداز
بغیر بیر کے ان بن، غرض سے پاک تپاک
غرض سے پاک یہ آنسو غرض سی پاک ہنسی
یہ دشتِ دہر میں ہمدردیوں کا سرچشمہ
قبولیت کا یہ جذبہ، یہ کائناتِ حیات

اس ارضِ پاک پر ایمان، یہ ہم آہنگی
ہر آدمی سے ہر اک خوب و زشت سے لگاؤ
یہ ماں کی گود کا احساس سب مناظر میں
قریب و دور زمیں میں یہ بوئے وطنیت
نظامِ شمس و قمر میں پیامِ حفظِ حیات
بچشمِ شام و سحر مامتا کی شبنم سی
یہ سازِ دل میں مرے نغمۂ انا الکونین
ہر اضطراب میں روحِ سکونِ بے پایاں
زمانۂ گزراں میں دوام کا سرگم سی
یہ بزمِ جشنِ حیات و ممات سجتی ہوئی
کسی کی یاد کی شہنائیاں سی بجتی ہوئی
یہ رمزیت کے عناصر، شعورِ پختہ میں
فلک یہ وجد میں لاتی ہے جو فرشتوں کو
وہ شاعری بھی بلوغِ مزاجِ طفلی ہے
یہ نشتریتِ ہستی، یہ اُس کی شعریت
یہ پتّی پتّی یہ گلزار زندگی کے کسی

لطیف نور کی پرچھائیاں سی پڑتی ہوئی
بہم یہ حیرت دہانو سیت کی سرگوشی
بشر کی ذات کہ مہرِ الوہیت یہ جبیں!
ابد کے دل میں جڑیں مارتا ہوا سبزہ
غمِ جہاں کبھی مجھے آنکھیں دکھا نہیں سکتا
کہ آنکھیں دیکھے ہوئے ہوں میں اپنے بچپن کی
مرے لہو میں ابھی تک سنائی دیتی ہیں
سکوتِ حزن میں بھی گھنگھروؤں کی جھنکاریں
یہ اور بات کہ میں اس پہ کان دے نہ سکوں
اسی ودیعتِ طفلی کا اب سہارا ہے
یہی ہیں مرہم کافور دل کے زخموں پر
انہی کو رکھنا ہے محفوظ تا دمِ آخر
زمینِ ہند ہے گہوارہ آج بھی ہمدم
اگر حساب کریں دس کروڑ بچوں کا
یہ بچے ہند کی سب سے بڑی امانت ہیں
ہر ایک بچہ میں ہیں صد جہانِ امکانات

مگر وطن کا حل و عقد جن کے ہاتھ میں ہے
نظامِ زندگیِ ہند جن کے بس میں ہے
رویہ دیکھ کے اُن کا یہ کہنا پڑتا ہے
کسے پڑی ہے کہ سمجھے وہ اس امانت کو
کسے پڑی ہے کہ بچوں کی زندگی کو بچا لے
خراب ہونے سے مٹنے سے سوکھ جانے سے
بچائے کون ان آزردہ ہونہاروں کو؟
وہ زندگی جسے یہ دے رہے ہیں بھارت کو
کروڑوں بچوں کے مٹنے کا اک المیہ ہے
چُرائے جاتے ہیں بچے ابھی گھروں سے یہاں
کہ جسم توڑ دیے جائیں اُن کے تاکہ ملے
چُرانے والوں کو خیرات ہاگھ میلے کی
جو اس عذاب سے بچ جائیں تو گلے پڑ جائیں
وہ لعنتیں کہ ہمارے کروڑوں بچوں کی
ندیم خیبر سے مٹی خراب ہو جائے
وہ مُفلسی کہ خوشی چھین لے وہ بے برگی

اُداسیوں سے بھری زندگی کی بے رنگی
وہ یاسیات کہ جس کو چھوئے شعاعِ اُمید

وہ آنکھیں دیکھتی ہیں ہر طرف جو بے نوری
وہ ٹکٹکی کہ جو پتھرا کے رہ گئی ہو ندیم

وہ بے دلی کہ ہنسی چھین لے جو ہونٹوں سے
وہ دُکھ کہ جس سے ستاروں کی آنکھ بھر آئے

وہ گندگی وہ کثافت مرض زدہ پیکر
وہ بچے چھن گئے ہوں جن سے بچپنے اُن کے

ہمیں نے گھونٹ دیا جن کے بچپنے کا گلا
جو کھلتے پینے گھروں کے ہیں بچے اُن کو بھی کیا

سماج بھولتے پھلنے کے دے سکی سادھن
وہ سانس لیتے ہیں تہذیب کش فضاؤں میں

ہم اُن کو دیتے ہیں بے جان اور غلط تعلیم
ملے گا علم جہالت نما سے کیا اُن کو

نکل کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے
یہ بدنصیب نہ گھر کے نہ گھاٹ کے ہوں گے

میں پوچھتا ہوں یہ تعلیم ہے کہ مکاّری
کروڑوں زندگیوں سے یہ بے پناہ دغا
نصاب ایسا کہ محنت کریں اگر اس پر
بجائے علم جہالت کا اکتساب کریں!
یہ الٹا درس ادب یہ سڑی ہوئی تعلیم
دماغ کی ہو غذا یا غذائے جسمانی
ہر اک طرح کی غذا میں یہاں ملاوٹ ہے
وہ جس کو بچوں کی تعلیم کہہ کے دیتے ہیں
وہ درس اُلٹی چھری ہے گلے پہ بچپن کے
زمینِ ہند ہنڈولہ نہیں ہے بچّوں کا
کروڑوں بچوں کا یہ دیس اب جنازہ ہے
ہم انقلاب کے خطروں سے خوب واقف ہیں
کچھ اور روز یہی رہ گئے جو لیل و نہار
تو مول لینا پڑے گا ہمیں یہ خطرہ بھی
کہ بچے قوم کی سب سے بڑی امانت ہیں

تقسیمِ دولت

اے اہلِ طرب رنج والم بانٹ رہا ہوں
خوشیاں بھی ہوں قربان وہ غم بانٹ رہا ہوں

اک شعلۂ اعجاز رقم بانٹ رہا ہوں
ہے نوک پہ جادو وہ قلم بانٹ رہا ہوں

ہے موت سے بھی ساز وہ ہوں زندۂ جاوید
امرت کے اُڑیں ہوش وہ سم بانٹ رہا ہوں

چھیڑی وہ غزل میں نے کہ ہیں وجد میں کونین
اور یوں تو کوئی کیف نہ کم بانٹ رہا ہوں

ہے مسکنِ آہوئے ختن ہر دلِ پُر کیف
جادو بھری آنکھوں کا بھرم بانٹ رہا ہوں

پڑتی ہیں سرِ عالمِ اسرار کمندیں
لہرائی ہوئی زلف کے خم بانٹ رہا ہوں

افکار مرے چیر گئے سینۂ آفاق
اشعار ہیں یا تیغِ دو دم بانٹ رہا ہوں

اس پردۂ آواز سے پُو پھوٹ رہی ہے
فردا کے جلوسوں کے علَم بانٹ رہا ہوں

یہ مہر و وفا کے جو سُناتا ہوں ترانے
اے دوست ترے لطف و کرم بانٹ رہا ہوں

کروٹ نئی لیتے ہیں زمانے کے ارادے
دُنیا میں نئے قول و قسم بانٹ رہا ہوں

کھاتا ہوں شہنشاہیِ جمہور کی سوگند
میں سلطنتِ قیصر و جم بانٹ رہا ہوں

چونکا نہ دیں ایمان کو یہ کفر کے تحفے
بول اُٹھنے کو ہیں جو وہ صنم بانٹ رہا ہوں

لیتی ہے مری بات کو کچھ یوں نئی دُنیا
جیسے کوئی انمول رقم بانٹ رہا ہوں

اشعار کی یہ حُسنِ بندش ہے بہانہ!
اے دوست! تری شوخیِ رم بانٹ رہا ہوں

یہ نغمہ سرائی ہے کہ دولت کی ہے تقسیم
انسان کو انساں کا غم بانٹ رہا ہوں

جس سے مرے وجدان میں پلتے ہیں خیالات
جمہور میں وہ ناز و نعم بانٹ رہا ہوں

انفاسِ خزاں دیدہ کو شعلوں میں بسا کے
ویرانوں کو گلزارِ ارم بانٹ رہا ہوں

پیشانیٔ مستقبلِ انساں ہے منور
وہ شعلے مہر دیر و حرم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ عرب آؤ ان اشعار کو پرکھو
کچھ سوچ کے میراثِ عجم بانٹ رہا ہوں

معیارِ سخن اس سے جھک جائے تو ہے بات
جس دولتِ افکار کو کم بانٹ رہا ہوں

ہر دیدۂ مشتاق میں شبنم کی جھلک ہے
آنکھوں میں جو پنہاں ہے وہ نم بانٹ رہا ہوں

خلاقِ تمدن ہے یہی نسبتِ عشق
ہستی کو میں پیغامِ عدم بانٹ رہا ہوں

اشعار ہیں یا گنجِ گراں مایۂ فطرت
نغموں کے وہ دینار و درم بانٹ رہا ہوں

یہ تلخ نوائی مری ضامن ہے بقا کی
جو جانِ کرم ہے وہ ستم بانٹ رہا ہوں

تعمیر کریں گے نئی دُنیا، نئی دُنیا
کمزوروں میں، وہ زورِ ہمم بانٹ رہا ہوں

ہر چیز کا چولا ہی بدل دوں گا سرے سے
سنسار کو اک اور جنم بانٹ رہا ہوں

دُنیا کو نئے دور کی دیتا ہوں بشارت
یا اک نئی تقدیرِ اُمم بانٹ رہا ہوں

کل جن سے بدلنے کو ہے تقدیر بشر کی
میں آج وہ افکارِ اہم بانٹ رہا ہوں

اے اہلِ ادب آؤ، یہ جاگیر سنبھالو!
میں مملکتِ لوح و قلم بانٹ رہا ہوں

کھلتا ہی نہیں مجھ پہ فراقؔ اپنی صدا سے
کیا کیا اثرِ شادی و غم بانٹ رہا ہوں

دھرتی سنگیت

دھرتی تو خلا کی رقاصہ، دامن میں لیے ہر دشت و چمن

ہے میرے کلام کی بندش میں دھرتی کا سکوں دھرتی کا چلن

ان نغموں میں ہم دھرتی کا سورج سے بیاہ رچاتے ہیں

اس عقد کا جشن مناتے ہیں یہ چنگ و رباب، رقصِ سخن

شاعر سے خیالوں کی لالی دھرتی کی دمکتی بندی ہے

ہر کاوشِ پنہاں، دھرتی کے ہی اُٹھتے ہوئے گھونگھٹ کی پھبن

بل کھائے ہوئے دریاؤں میں تیری ہی لٹیں ہیں چھٹکی ہوئی

لہرائے ہوئے صحراؤں میں تیرے ہی سلگتے دل کی جلن

خط کہسار میں تیرے ہی ابرو کی اُپنی تلوا ریں ہیں!

ہر لالہ و گل میں تیرے ہی کو دیتے ہوئے مکھڑے کی پھبن

دھرتی کا سہاگ دمکتا ہے اشعار کی شعلہ نوائی میں

جب روحِ نبات مچلتی ہے دھرتی کا آنگنا ہے جو بن

ست رنگ شعاعوں کی لرزش تیری ہی آنکھوں کے ڈورے
ندی ساگر میں پڑتے بھنور تیرے ہی رُخ کے چاہِ ذقن

سنسار کی سنہری صبحوں میں تو ہی لیتی ہے انگڑائی
کرنوں کی صبوحی چھلکی ہوئی حسن کا ہر گھونٹ خمار شکن

دھرتی کی چمک، دھرتی کی جھلک، دھرتی کی لہک، دھرتی کی مہک
صحرا صحرا، دریا دریا، وادی وادی گلشن گلشن

تو سورج کی وہ کٹی پسلی جو کوکھ بنی تہذیبوں کی
گودی میں پلے ہیں، کھیلے ہیں، ہر علم و عمل، ہر جادۂ فن

دھرتی حسن کا ہر افسانہ، افسانہ در افسانہ ہے
اُڑ جاتی ہے نیند ستاروں کی، لیتے ہیں جمائی دشت و دمن

دھرتی پر پچھلی راتوں کو میخانۂ غیب اُترتے ہیں!
ہر صبح بہار پیالہ فگن، ہر لالۂ صحرا صاعقہ زن

گذرے ہیں دھرتی سے ہو کر قرنوں سے قافلۂ ماضی
محفوظ ہیں اس کے سینے میں ناموسِ ازل، آئینِ کہن

خم و پیچِ زماں، خم و پیچ مکاں اس رقصِ سرمدی کے جلوے
یہ سینۂ وقت کا زیر و بم، دھرتی کے ہی دل کی ہے دھڑکن

تیرا سورج سے بچھڑنا تھا یا تھی سیتا کی جلا وطنی

ہاں لَو کُش[1] کانڈ کہیں جس کو دنیا ہے وہ باب رامائن

تیرے ارمان نکالیں گے ماتا! ہم سورج کے بیٹے

تیرے قدموں میں ڈالیں گے سورج کے مکٹ کے لعل یمن

ہر جگ میں ہم تو دیتے رہے ہیں تیرے لئے ہر قربانی

ہر دور میں ہم تو لٹاتے رہے ہیں، تیری خاطر تن من دھن

ماتھے پہ بجلیوں کا جھومر، ساگر لہریں زنجیر کمر

ست رنگ بہاریں گھونگھٹ میں لہرائی شفق تیرا دامن

تو کوکھ مانگ سے ٹھنڈی رہے تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے

سنتان کی لے گینا بجلی، ہم ہیں تیرے سنگار ابرن

○

---

[1] لَو اور کُش سیتا کے دو بیٹے تھے۔ رامائن میں "لَو کُش کانڈ" وہ باب ہے جس میں سیتا کی جلا وطنی اور اُن کے بیٹوں کی جوانمردی کا حال ہے۔ سیتا زمین سے پیدا ہوئی تھیں اور رام سورج بنسی تھے۔ استعارۃً سیتا اور رام کی کہانی زمین کے سورج سے جدا ہونے اور پھر مل جانے کی کہانی ہے۔

رباعیاں

ہر ایک دریا فراقؔ دریا دریا
ہر ایک صحرا فراقؔ صحرا صحرا
محدود کوئی چیز نہیں عالم میں
ہر ایک دُنیا فراقؔ دُنیا دُنیا ○

ہم چھان چکے ہیں نا چشیدہ یہ نہیں
کھنچتی ہے دل میں نا کشیدہ یہ نہیں
ہم ہیں آفاق کے ہمارا آفاق
یہ تجربہ ہے کوئی عقیدہ یہ نہیں ○

ہوں دہریہ ایمان مرا دہریت ہے
حیرت سے بھری دہر کی کیفیت ہے
رمزیت دہر ماورا لئے تشریح
رمزیت بس فراقؔ رمزیت ہے

ڈنیائے دُنی سے نسبت ہی نہیں
وہ میرے تصوف میں حقیقت ہی نہیں
کہتے ہیں خدا و روح و مذہب جس کو
وجدان کو ان سب کی ضرورت ہی نہیں

بے عقل دماغ کی نگاہ بینا
وجدان سے ہو جاتا ہے روشن سینہ
قدرت کے مظاہر کو یہ آئینہ دکھائے
انسان پہ قدرت کو کرے آئینہ

احساس سے ہر پردہ اُٹھا دیتا ہے
خود عقل کو وہ اس کا پتہ دیتا ہے
خود ساختہ جال میں ہے پھنس جاتی عقل
وجدان اُسے آگاہ کرا دیتا ہے

آفاق بس آزمائشوں کا تو نہیں
جوہر جسے کہئے ماشہ تولہ تو نہیں
ہر شے عقل جانچ تو لیتی ہے
لیکن یہ جانچنا پرکھنا تو نہیں

کیا عقل کے بیوپار میں خیر و برکت
بے پایاں بے کراں ہے دل کی دولت
ہے علم اگر خبر تو وجدان نظر
ہشیاری بیچ کر خرید و حیرت!

جس وقت کھُلا حقیقتوں کا بازار
چل نکلا یقین دین کا کاروبار
صرافے میں عقل کے نہ تھیں اشرفیاں
ہر سمت تھے ریزہ گاریوں کے انبار

ہیں دہریوں کے بھی تو سجود و رکوع
گر دل میں ترے نظامِ شمسی ہو طلوع
اللہ نہیں یہ کائنات او ناداں
ہے ذکر و فکر کا مناسب موضوع

ہے بہتوں کی عقل اک جیتا مُردہ
دم توڑ گئی خبر سے جس شے کو چھُوا
آفاق نمودِ زیست سے پہلے بھی
اک زندہ نظام تھا جناب والا

زندہ آفاق کے حقائقِ اعلیٰ
سانچے ہیں موت کے ہر اک کو ڈھالا
وہ عقل ہی کیا ہے جو سوکھے کا روگ
وجدان نے مجھ کو خونِ صالح ڈالا

ہے اس میں شخصیت کا یکسر نقصان
اک رگ ہو جاں دار اک رگ ہو بیجان
ان سے ملتا ہے علم بے رس جس کا
عقل حسّاس اور بے حس وجدان

شاداب ازل سے یہ بیابان نہیں
رہتی دنیا فراق ویران نہیں
احساسِ وطن تصوّرِ دہر سے ہو
یہ درکِ کائنات آسان نہیں

یکطرفہ شخصیت کے سارے ہیں فتور
یہ سب ہے نقشِ نامکمل کا قصور
عقل و وجدان میں تصادم نہ رہے
ہو خود سے ہم آہنگ ترا نظم شعور

خود عقل کی آنکھ جس سے بھر آتی ہے
رنگت رُخِ دہر کی نکھر آتی ہے
وجدان کی روشنی ہے یا صبحِ بہار
دُنیا کتنی حسین نظر آتی ہے

○

اے عقل ہے اگرچہ صاف تیری نیت
دیتی ہے ہمیں حقیقتوں کی دولت
وجدان ہٹائے نہ اگر تیرا ہاتھ
ہرگز ترے ہاتھ میں نہ آئے برکت

○

تحقیق و تجسس میں رہے تو دن رات
احساس جمال بھی تو ہے جزِ حیات
گھاٹے میں رہے گا تو یہ سودا کرکے
حیرت بیچ کر نہ لے معلومات

○

اس طرح تو دُنیا کا سمجھنا ہی محال
تشریح سے کب کھلا مظاہر کا حال
یکطرفہ خرد کاش ادھر بھی دیکھے
اس جانب جزئیات، اس سمت اجمال

(نعمہ نما)

دیتی ہے خرد مشاہدوں کو ترتیب
کرتا ہے عشق اُن سے پھر ہم کو قریب
اک قدرِ مشترک ہے وہ دونوں میں
کہتے ہیں اسی کو ارتقائے تہذیب

وجدانِ جمالیات کی تھی جو کمی
مردہ کثرت میں زندہ وحدت نہ ملی
گو عقل نے بے شمار تحقیقیں دیں
اربوں اعداد سے اِکائی نہ بنی

کہتے ہیں کہ جیسے کو ملا ہے تیسا!
داد ایسی ملی شعر کہا تھا جیسا!
احمق ہے کہے عقل کو جو ناکافی
ہم عقل سے محروم ہیں۔۔ اچھا! ایسا؟

اے دوست! سمجھ حیاتِ انساں کے رموز
کیا پوچھ رہا ہے مجھ سے یزداں کے رموز
ہے اصلِ حقیقت ارتقائے تہذیب
وہ عشق و عمل میں ربطِ پنہاں کے رموز

اب ایک بیابان ہے شاداب وجود
اسباب و علل کی خاک اُڑائی بے سود
دھندلی پڑ جائے گی جگمگاتی دُنیا
اتنے نہ ہوں احساس ترے گرد آلود

وہ ہستیِ کائنات لیتی ہوئی لہر
اب خاک اُڑا رہی ہے کیسا ہوا قہر
ہستی کو کیا عقل نے دشتِ ویراں
اس صحرا سے نکال وجدان کی نہر

ہستی کا محال جائزہ اور حساب
نادان! ستر ہزار حائل ہیں حجاب
کُھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں
پیدا کرے نگاہ میں استعجاب

حیرت کدہ بن کے اور کڑھ جاتی ہے
دُنیا نظروں میں اور چڑھ جاتی ہے
ہوتی ہے جب اُسکی خوابناکی معلوم
اصلیتِ دہر اور بڑھ جاتی ہے

زنجیر حقیقتوں کی لہراتی ہے
جھنکار کی پُر رمز صدا آتی ہے
حیرت سے عقل آنکھ جھپکاتی ہے
ایسے میں دل کی آنکھ کھل جاتی ہے

سب دیکھ کے کچھ بھی تو دیکھا افسوس
سب جان کے کچھ بھی تو نہ جانا افسوس
ہستی سے ہو سکے گا کیا تو مانوس
مانوس کو معجزہ نہ سمجھا افسوس

اُس دن سے ہوا علم میں گڑ بڑ کھاتا
کیا فیض صحبت اس سے عالم پاتا
جب عقل سمجھ بیٹھی ہے خود کو کافی
وجدان سے قطع کر کے رشتہ ناتا

عقل و وجدان کی وہ ہاتھا پائی
خود سے ہر ایک صلاحیت ٹکرائی
اس جنگ میں وجدان کے کام آنے کے بعد
ہے کتنی ڈراؤنی عقل کی تنہائی

تشریحِ حیات و اصطلاحاتِ دماغ

دن کا کب بن سکی ہے آئینہ رات
اُبلی پڑتی ہے زندگی رگ رگ میں
اقلیدس کی نہیں ہے اشکالِ حیات

○

منطق کی مدد سے رازِ پنہاں معلوم
از نفسیات رازِ انساں معلوم
ہے عقل کی خوردبین ہر پتی پر
اس تجزیہ سے علمِ گلستاں معلوم

○

ہر کاہ سے صد درسِ نمو لیتا ہوں
ہر ماہ سے صد جام و سبو لیتا ہوں
کہ دمہ کی رگِ بیروں پہ نشتر بے سود
کہ دمہ کی رگِ دروں کو چھو لیتا ہوں

○

وہ ہے وجدانِ گُل کو جو پہچانے
تجزیہ و عمل کا انتر جانے
سولہ آنوں کا روپیہ ہوتا ہے
یا ہوتے ہیں روپے میں سولہ آنے

بیداریِ بے کراں وجدان کے خواب
چہرہ دلسا سے حقیقتوں کے اٹھتے ہیں نقاب
بس مسجد تک فراق ملّا کی دوڑ
جو لانگہِ عقل تجربوں کی محراب

پیمائش و تقسیم و ہیولیٰ تو نہیں
دنیا کا احتساب ، دنیا تو نہیں
ہر شے کو عقل ناپ تو لیتی ہے
لیکن ناپنا سمجھنا تو نہیں

اجزائے جہاں کو سمجھ اصل جہاں
محدود نہیں ہے دہر کی رسم رواں
ہر چیز جسے کہتے ہیں آنی جانی
ہے واقعوں کا سلسلۂ بے پایاں

محدود کئے بغیر کیونکر سمجھے
محدود کئے بغیر کیونکر سمجھے
بے پایاں بے شمار جلوے انہیں عقل
محدود کئے بغیر کیونکر سمجھے ۔

عقل اپنا اثر ڈالتی ہے ہر شے پر
وجدان براہ راست لیتا ہے اثر
عقل و وجدان دونوں لیتے ہیں علم
وہ علم عرض تو یہ علم جوہر

دارالصحت ہے اُس کو وجدان کا دیار
اس آب و ہوا میں دیکھ ہستی کا نکھار
ہے عقل کے اسپتال میں جب تک زیست
چہرے پہ آب و رنگ آنا دشوار

جاگ اُٹھے گی روح تم سو جاؤ گے
سرچشمۂ زندگی میں دھو جاؤ گے
کھو جاؤ گے جب مناظرِ قدرت میں
تو خود سے بہت قریب ہو جاؤ گے

محفل میں پہنچ کے حُسنِ محفل بھی تو دیکھ
منزل پہ پہنچ کے حُسنِ منزل بھی تو دیکھ
تو تیر گئی ہے بحرِ ہستی اے عقل !
ساحل پہ پہنچ کے حُسنِ ساحل بھی تو دیکھ

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے؟
دُنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے؟
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ!
سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے؟